ماہنامہ

اپریل 2025ء

طلوعِ اسلام

لاہور

اشاعت کا اکیاسی واں سال

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (الحدیث)

حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مذہب اور دینِ اسلام کا تقابلی جائزہ

یورپ نے غالباً مانی کے عقیدے سے روح کو مادہ کی ثنویت کا خیال اخذ کیا اور بلا تنقید اسے قبول کر لیا۔ اسی نظریہ کی بنیاد پر انہوں نے مذہب (Religion) اور سیاست (State) کی ثنویت کا تصور پیش کیا۔ قرآنِ کریم میں مذہب کا لفظ ہی کہیں نہیں آیا۔ اس لئے اسلام کو مذہب نہیں بلکہ قرآن کے دیئے ہوئے دین کے نام سے پکارنا چاہئے۔ اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ (3:19)-

مذہب	دینِ اسلام
1- مذہب، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق اور داخلی تجربہ کا نام ہے۔	دین اجتماعی نظامِ زندگی اور خارجی حقیقت ہے۔
2- مذہب میں ہر فرد اپنے طور پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کا خدا کے ساتھ رشتہ قائم ہو گیا ہے۔	دین میں معاشرہ کا انداز اور آئین بتا سکتے ہیں کہ وہ قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہوا ہے یا نہیں۔
3- مذہب میں ہر فرد کا منتہیٰ اپنی اپنی نجات ہوتا ہے۔	دین کا مقصود عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔
4- مذہب میں کوئی خارجی معیار ایسا نہیں ہوتا جس سے پرکھا جا سکے کہ انسان کے اعمال صحیح نتائج پیدا کر رہے ہیں یا نہیں۔	دین میں اجتماعی زندگی کے نتائج ساتھ کے ساتھ بتاتے چلے جاتے ہیں کہ ملت صحیح راستے پر چل رہی ہے یا نہیں۔
5- مذہب انسان کو مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور اس میں ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پر سمجھ کر خوش ہوتا ہے۔	دین میں تفرقہ کو شرک کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ پوری نوعِ انسانی سے مخاطب اور اس کا رب، رب العالمین اور رسول رحمۃ للعالمین کا مقام رکھتے ہیں۔
6- مذہب عوام کے جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور ان کی تسکین کا سامان فراہم کئے چلا جاتا ہے۔ اس لئے اس کی تعلیم یہ ہے۔ زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز	دین، انہیں حقائق کے پیچھے چلاتا ہے اور ان کے سطحی جذبات کی تسکین کی بجائے ان پر قابو پانے کی تعلیم یوں دیتا ہے۔ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز
7- مذہب انسان کے دل میں ہر وقت خوف پیدا کرتا رہتا ہے اور اپنی ہر بات ڈر سے منواتا ہے۔	دین خوف کو شرک قرار دیتا ہے اور انسان کے دل کو جرأت اور بے باکی کا مسکن بناتا ہے۔

بقیہ صفحہ نمبر 58 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور
اپریل 2025ء

جلد 78 شمارہ نمبر 04

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 600 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا؟	پرویز علیہ الرحمہ	4
تقاریب بیادِ پرویز علیہ الرحمہ تصویری جھلکیاں	ادارہ	26
سیکولرزم اور ہماری نئی نسل	ڈاکٹر اعجاز رسول، گلاسگو	37
ڈاکٹر خالد سندھو کی وفات پر تعزیت	ڈاکٹر اعجاز رسول، گلاسگو	41
خطاب بتقریب بیادِ پرویز علیہ الرحمہ	خورشید انور، سوات	42
تقریر تقریب بیادِ پرویز علیہ الرحمہ	اقبال ادریس ایڈووکیٹ، سوات	48
فکرِ پرویز علیہ الرحمہ سے اختلاف ملک وملت کے لئے نقصان یا اصلاح؟	وسیم احمد یزدانی، ایبٹ آباد	52

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
idarati@gmail.com
www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
چہ باید مرد را طبعِ بلندے، مشربِ نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

پرویز علیہ الرحمہ

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

بتقریب یومِ پاکستان

ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا؟

23 مارچ 1940ء کو اقبال پارک لاہور میں (جسے اس زمانے میں منٹو پارک کہتے تھے) غیر منقسم ہندوستان کے مسلمانوں کے اجتماعِ عظیم میں، انتہائی جوش وخروش اور جذب و خلوص کے ساتھ، وہ ریزولیوشن پاس ہوا جسے ''قرارداد پاکستان'' کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس میں مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ، آزاد مملکت کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اُس زمانے میں ہر ایک کو معلوم تھا کہ اس مملکت کا مطالبہ کیوں کیا گیا ہے اور اس کی غرض وغایت کیا ہے کیونکہ اس کا مطالبہ کرنے والوں (علامہ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ) نے اس کی اس طرح وضاحت کردی تھی کہ اس میں نہ کسی شک وشبہ کی گنجائش تھی اور نہ ہی کسی التباس و ابہام کا امکان۔ لیکن (جائے صد حیرت ہے کہ) حصولِ پاکستان کے بعد اس مملکت کی غرض و غایت اور اس کا مطلوب ومقصور (یا نصب العین) آہستہ آہستہ نگاہوں سے اوجھل ہوتا چلا گیا۔ جن لوگوں نے اس مطالبہ کی تحریک میں حصہ لیا تھا یا جو اس کے عینی شاہد تھے، رفتہ رفتہ وہ بھی دنیا سے چلے گئے،__ اور باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہماری نئی نسل (یا یوں کہیئے کہ موجودہ قوم) کے ذہن سے اس کا تصور ہی محو ہو چکا ہے۔ حتیٰ کہ ان میں سے بعض کو یہ کچھ کہتے بھی سنا گیا ہے کہ تقسیمِ ہند کا فائدہ کیا تھا اور ہم نے الگ مملکت بنا کر حاصل کیا کیا؟ اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کے وساوس کے عام کرنے میں پاکستان دشمن عناصر کی سازش بھی کارفرما ہوتی ہے لیکن ہمارا نوجوان طبقہ ان سے متاثر اس لئے ہو جاتا ہے کہ اس قسم کے اعتراضات کا مناسب جواب اس کے پاس نہیں ہوتا۔

> قارئینِ طلوعِ اسلام کا وہ طبقہ جو شروع سے اس کے ساتھ وابستہ چلا آ رہا ہے، بعض اوقات اس تکرار کو خوش آئند نہیں قرار دیتا لیکن اس کے باوجود ہم اس کی بار بار نشر و اشاعت کو نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ قوم کی مثال تو ایک جوئے رواں کی سی ہوتی ہے جس میں ہر آن نیا پانی سامنے آتا ہے۔ یعنی قوم کے پرانے افراد آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور نئے افراد ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ قوم کے یہ نئے افراد ہیں جو پاکستان کی غرض وغایت سے بے بہرہ ہیں اور ان کی معلومات کے لئے ضروری ہے کہ اسے بار بار سامنے لایا جائے۔

طلوعِ اسلام نے اپنا فریضہ قرار دیا کہ وہ اس مملکت کی تشکیل کی غرض و غایت کی عام نشر و اشاعت کرتا رہے۔ چنانچہ وہ گذشتہ کئی دہائیوں سے اس فریضہ کو مسلسل ادا کئے چلا آ رہا ہے۔ چونکہ پاکستان کی غرض و غایت متعین تھی اس لئے ظاہر ہے کہ جب اسے بار بار سامنے لایا جائے گا تو اس میں تکرار لازمی ہوگی۔ چنانچہ قارئینِ طلوعِ اسلام کا وہ طبقہ جو شروع سے اس کے ساتھ وابستہ چلا آ رہا ہے، بعض اوقات اس تکرار کو خوش آئند نہیں قرار دیتا لیکن اس کے باوجود ہم اس کی بار بار نشر و اشاعت کو نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ قوم کی مثال تو ایک جوئے رواں کی سی ہوتی ہے جس میں ہر آن نیا پانی سامنے آتا ہے۔ یعنی قوم کے پرانے افراد آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور نئے افراد ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ قوم کے یہ نئے افراد ہیں جو پاکستان کی غرض و غایت سے بے بہرہ ہیں اور ان کی معلومات کے لئے ضروری ہے کہ اسے بار بار سامنے لایا جائے۔ یہ وجہ ہے کہ طلوعِ اسلام ان مقالات و خطابات کو بتکرار و اصرار شائع کرتا رہتا ہے' اس اُمید کے ساتھ کہ ؎

ہمارے مروجہ تصورِ اسلام کی رُو سے' اقامتِ صلوٰۃ کے معنی ہیں صرف نماز پڑھنا اور ایتائے زکوٰۃ سے مفہوم غریبوں اور گداگروں کو کچھ پیسے بطورِ خیرات دے دینا۔ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے مقصود ہے لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنا۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی بات کے لئے بھی اپنی آزاد مملکت کی ضرورت نہیں۔

شاید کہ خود را باز آفرینی!

اسی مقصد کے پیشِ نظر، یوم پاکستان (23 مارچ) کی تقریب پر سطورِ ذیل پیشِ خدمت ہیں۔

❁❁❁❁❁

اسلام، ایک زندہ نظامِ حیات بننے کے لئے، اپنی آزاد مملکت کا متقاضی ہے۔ یہ وہ شرط ہے جس کے پورا نہ ہونے سے وہ دیگر مذاہب کی طرح ایک مذہب بن کر رہ جاتا ہے، دین یعنی نظامِ حیات نہیں بن سکتا۔ (مثلاً) اس نظام کے بنیادی ستون اقامتِ صلوۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہیں' اور اس کا اصل الاصول، امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ ہمارے مروجہ تصورِ اسلام کی رُو سے' اقامتِ صلوٰۃ کے معنی ہیں صرف نماز پڑھنا اور ایتائے زکوٰۃ سے مفہوم غریبوں اور گداگروں کو کچھ پیسے بطورِ خیرات دے دینا۔ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے مقصود ہے لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنا۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی بات کے لئے بھی اپنی آزاد مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہ فرائض، ہم انگریز کے عہدِ غلامی میں بھی آزادانہ ادا کر سکتے تھے اور آج بھارت کا مسلمان، بایں ہمہ بے بسی و بے کسی، انہیں اپنے طور پر ادا کر سکتا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم ان کی ادائیگی کے لئے اپنی حکومت کا قیام لازمی شرط قرار دیتا ہے جہاں کہتا ہے کہ: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿٤١﴾ (22:41) یہ وہ لوگ ہیں (یعنی جماعت مومنین) کہ جب انہیں حکومت ملے گی تو یہ اقامتِ صلوۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا انصرام کریں گے۔ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کا فریضۂ حیات ہوگا۔ یا

(مثلاً) مذہبی سطح پر اسلام سے مقصود یہ ہے کہ انسان خدا کی عبادت کرے اور شرک سے مجتنب رہے یعنی بتوں کی پرستش نہ کرے۔ اس مقصد کے لئے بھی اپنی آزاد مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہ ہر مقام پر، ہر حال میں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم میں ہے کہ دین کے تمکن کے لئے استخلاف فی الارض ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر نہ خدا کی عبودیت اختیار کی جاسکتی ہے اور نہ شرک سے اجتناب ممکن ہے۔ سورۂ نور میں ہے کہ خدا نے تم سے حکومت کا وعدہ کر رکھا ہے تا کہ تم اس کی عبودیت اختیار کر سکو اور شرک سے بچ سکو ـــــ یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا ط (24:55)۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا تو قبیلہ بنی عامر کا ایک بہت بڑا سردار آپ کے پاس آیا اور اس دعوت کے مقاصد کے متعلق وضاحت چاہی۔ آپ کی وضاحت پر اس نے پوچھا کہ اگر میں ان امور پر کاربند ہو گیا تو مجھے کیا ملے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت، یعنی باغ و بہارِ آخرت ـــــ ہمیشہ رہنے والی زندگی ـــــ اس نے کہا کہ یہ بعد کی بات ہے۔ میں یہاں کے متعلق معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ـــــ نعم النصر والتمکین فی البلاد۔ اس دنیا میں فتوحات اور حکومت حاصل ہوگی۔ (الکامل)

اسلام کا تقاضا:

یہ تھا اسلام کے دین (یعنی زندہ نظامِ حیات) بننے کا تقاضا، جس کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

> اس سے اسلام، اپنی تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے گا اور انہیں عصرِ حاضر کی روح کے قریب تر لانے کے قابل بنا سکے گا۔ (خطبۂ الٰہ آباد۔ 1930ء)

اس سے بھی پہلے انہوں نے اپنے خطبات میں اس حقیقت کی وضاحت کر دی تھی کہ

> اسلامی نقطۂ نگاہ سے' مملکت اس کوشش کا نام ہے جس کی رُو سے اسلام کے مثالی تصورات کو زمان و مکان کی قوتوں میں منتقل کیا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت ان بلند تصورات کو انسانی ہیئتِ اجتماعیہ میں منتقل کرنے کا نام ہے۔

اس مملکت میں عبادت نام ہوتا ہے قوانینِ خداوندی کی محکومیت اختیار کرنے کا اور شرک سے مفہوم ہوتا ہے انسانوں کے خودساختہ احکام و قوانین کی اطاعت۔ اقامتِ صلوٰۃ سے مقصود ہوتا ہے ایک ایسے معاشرہ کا قیام جس میں تمام افرادِ معاشرہ ان قوانین کا از خود، بہ طیبِ خاطر، اتباع کرتے جائیں ❶۔ اور ایتائے زکوٰۃ سے مفہوم ہوتا ہے تمام افرادِ معاشرہ (بلکہ عالمگیر انسانیت) کو سامانِ نشوونما مہیا کرنا۔ اس میں امر بالمعروف کے معنی ہوتے ہیں ان احکام و ضوابط کا نافذ کرنا جنہیں قرآن صحیح تسلیم کرتا ہے اور اُن سے قانوناً روکنا جنہیں وہ مذموم قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں علامہ اقبالؒ نے لکھا تھا کہ:

❶ اجتماعاتِ صلوٰۃ اسی نظام کا ایک گوشہ اور اسی مقصود کے حصول کا ایک ذریعہ ہیں۔

اسلام، تخت وتاج سے وفا شعاری کا مطالبہ نہیں کرتا۔ وہ صرف خدا (کے قوانین) سے عہد وفا استوار کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔(خطبات)

اور قائداعظمؒ نے کہا تھا کہ:

اسلامی حکومت میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے۔جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام واصول ہیں۔اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست ومعاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول واحکام کی حکمرانی ہے۔اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔ (حیدرآباد دکن۔1941ء)

یہ ہے ایک اسلامی مملکت کی تخلیق وتشکیل کی وجۂ جواز۔اور یہ تھی وہ بنیاد جس پر مطالبۂ پاکستان کی عمارت استوار کی گئی تھی اور جس کے لئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔

لوحِ سادہ:

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اسلام کی انقلابی دعوت پیش کی تو اس میں مخالفین کے ساتھ سب سے بڑی وجۂ نزاع اور سب سے شدید سببِ تصادم کیا تھا؟ انہیں زندگی کے اس نظامِ نو کی طرف دعوت دی جاتی تھی اور وہ اس کے جواب میں کہتے تھے کہ:بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ﴿۲۲﴾(43:22) ہم اس نئے نظام کو اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں۔ہم اُسی مسلک پر چلتے رہنا چاہتے ہیں۔جو ہمارے اسلاف سے ہم میں متوارث چلا آرہا ہے۔ہم انہی کے نقوشِ قدم کا اتباع کریں گے۔ہم اپنی روایاتِ کہنہ کو نہیں چھوڑنا چاہتے۔اُن سے اس کے جواب میں کہا جاتا کہ:قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ؕ (43:24) جو کچھ تمہارے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔اگر یہ اُس سے بہتر ہو جس پر تم اپنے آباؤاجداد کی تقلید میں چلے جارہے ہو، تو کیا تم پھر بھی اپنے اسلاف کے مسلک ہی کو ترجیح دوگے؟ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہاں! ہم اُسی مسلک کا اتباع کریں گے۔ہمیں کسی نظامِ نو کی ضرورت نہیں ___ حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ (5:104) وہ مسلک ہمارے لئے ہر اعتبار سے کافی ہے۔یہ تھی وہ بنیادی کشمکش جو اس قدر شدید تصادمات کا موجب بنی۔جب ان مخالفین نے دیکھا کہ یہ نظام زور پکڑتا جارہا ہے تو انہوں نے چاہا کہ اس سے کچھ مفاہمت کی صورت نکل آئے۔یعنی کچھ باتیں اس نظامِ جدید کی لے لی جائیں اور کچھ ان کے مسلک آباء کی۔اور دونوں کے امتزاج سے ایک نظام وضع کرلیا جائے۔لیکن دین کے نقطۂ نگاہ سے ایسا کرنا شرک ہوتا ہے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بتاکید کہہ دیا گیا کہ:وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (11:113)۔دیکھنا! ان لوگوں کی طرف ذرا سا بھی جھک نہ جانا۔اگر تم نے ایسا کیا تو فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ (11:113)۔تمہاری جماعت بھی اسی

عذاب میں گرفتار ہو جائے گی جس میں یہ لوگ ماخوذ ہیں اور جس سے نکالنے کے لئے انہیں اس نظام کی طرف دعوت دی جا رہی ہے۔

لہٰذا، ایک قرآنی مملکت کی تشکیل کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ ان تمام نظریاتِ حیات وتصوراتِ زندگی، اِن تمام روایاتِ کہنہ اور مسالکِ قدیمہ کو پرکھا جائے جو اس قوم میں متوارث چلے آرہے ہیں۔ اس مملکت کا بنیادی پتھر ___ لا الٰہ الا اللہ ___ ہے۔ اس میں لا الٰہ کے معنی یہ ہیں کہ تمام مروجہ تصورات کا ازسرِنو جائزہ لیا جائے۔ اس کے بغیر، اس جدید نظام کی عمارت (جس کی بنیاد الا اللہ پر استوار ہوتی ہے) قائم ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ۔

ہر بنائے کہنہ کاباداں کنند اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

اسلام میں ''بت پرستی'' کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ بُت تو فارسی زبان کا لفظ ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کے لئے اوثان کا لفظ آیا ہے جو وثن کی جمع ہے اور وثن کے معنی ہوتے ہیں جمود و تعطل، عدم حرکت، جامد و غیر متحرک ہو جانا ___ اس بنیادی مفہوم کے اعتبار سے ہر وہ تصور یا نظام جس میں حرکت نہ رہے اور جامد ہو جائے وَثَنٌ ہے۔ جب قرآنی ضابطۂ حیات کو عملی شکل دے دی جائے تو اس سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے جو حرکتِ پیہم اور سعیٔ مسلسل کا آئینہ دار ہوتا ہے ___ ''حرکت پیہم'' کے معنی یہ ہیں کہ وہ معاشرہ، قرآنِ کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے زمانہ کے بدلتے ہوئے اور بڑھتے رہنے والے تقاضوں کا ساتھ دیتا چلا جاتا ہے۔ یوں یہ نظام ایک ذی حیات تحریک (DYNAMIC MOVEMENT) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اگر یہ کسی ایک مقام پر رُک جائے، اس میں جمود پیدا ہو جائے تو یہ وثنیت ہو گی۔ یہ وہ وثن (بت) ہے جس کی پرستش وہ قومیں کرتی ہیں جن پر ذہنی جمود اور عملی تعطل چھا چکا ہو۔ حیرت ہے کہ ہم نے قرآن کے اس عظیم نکتہ کو پس پشت ڈال دیا اور مغرب کے مفکرین کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ چنانچہ ''وہائٹ ہیڈ'' لکھتا ہے کہ

بُت پرستی کی کُنہ و حقیقت مروجہ خداؤں پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا ہے [1]۔

اس قسم کی بت پرستی میں، ایک زندہ اور متحرک نظامِ حیات کے تصورات و مناسک کی محض شکلیں باقی رہ جاتی ہیں۔ ان کے معانی و مفہوم ختم ہو جاتے ہیں۔ مذہب' دین کی ممی شدہ لاش ہوتا ہے۔ ان بے روح رسوم، اور بے جان معتقدات سے چپکے رہنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اس کے متعلق وہائٹ ہیڈ کہتا ہے کہ:

زندگی کے بے جان پیکروں کے ساتھ چپکے رہنے کا نتیجہ سست رفتار زوال ہوتا ہے جس میں ان رسوم کو بلا نتیجہ دہرایا جاتا ہے۔ اس سے تہذیب و ترقی کا محض سراب باقی رہ جاتا ہے۔ حقیقت غائب ہو جاتی ہے۔ (ایضاً)

انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ حیوان' بلا سوچے سمجھے اور بلا اختیار و ارادہ اپنے اسلاف کے مسلک پر

[1] A.N WHITEHEAD - ADVENTURE OF IDEAS - P.12

چلے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں آگے بڑھنے اور کچھ اور بننے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ بکری کا بچہ بکری ہی بن سکتا ہے۔ اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ نوعِ انسان کی یہ خوش قسمتی ہے کہ انسانی تاریخ میں ایسے ادوار آتے رہے جن میں تقلید کی ان برفانی سلوں کو توڑ کر کاروانِ انسانیت کے لئے آگے بڑھنے کا راستہ ہموار کیا گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج کا انسان بھی، اپنے اسلاف کی طرح، غاروں میں پڑا زندگی بسر کرتا۔ یاد رکھیئے، جوہرِ زندگی کی نمود، اپنے اختیار و ارادہ اور فکر و بصیرت سے، تعمیری کام سرانجام دینے سے ہوتی ہے۔ اگر وہ کام جنہیں عام طور پر نیکی کہا جاتا ہے، محض تقلیداً کئے جائیں تو یہ انسانی زندگی میں نشوو ارتقاء کا موجب نہیں بن سکتے۔ انسانی زندگی میں (MORAL) تو خیر بڑی چیز ہے، اس میں (IMMORAL) ہونا اتنا تباہ کن نہیں جتنا ہلاکت آفریں (AMORAL) ہوتا ہے۔ تقلید میں انسان (AMORAL) ہو جاتا ہے۔

یہی وہ جمود ہے جسے توڑنے کے لئے اقبالؒ کہتا ہے کہ ؎

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش　　براہِ دیگراں رفتن عذاب است
گراز دستِ تو کارے نادر آید　　گناہے ہم اگر باشد ثواب است

قرآنِ کریم نے اپنا تعارف کراتے یا یوں کہیئے کہ اپنے نزول کا مقصد بتاتے ہوئے کہا ہے کہ اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ ۝۱ (97:1)۔ یعنی قرآن دنیا میں نئی اقدار لایا ہے۔ اس کی آمد سے ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے تمام قدیم پیمانے الٹ گئے ہیں۔ اور ان کی جگہ ان نئے پیمانوں نے لے لی ہے۔ قرآن کی اولین مخاطب قوم کی طرف سے جو اس کی مخالفت ہوئی تھی تو اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اپنے قدیم پیمانوں کو، جو ان کے اسلاف کی طرف سے متوارث چلے آ رہے تھے، ان جدید پیمانوں سے بدلنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اقبالؒ نے جب پاکستان کا تصور دیا تھا تو اس مملکت کو وجود میں لانے کا مقصد یہ بتایا تھا کہ

> اس سے اسلام کو ایسا موقعہ میسر آ جائے گا جس سے یہ اس ٹھپہ کو مٹا سکے گا جو عرب ملوکیت نے زبردستی اس پر لگا رکھا ہے۔ (خطبہ الٰہ آباد)

روشِ کہن:

ہمارا مروجہ مذہب، ہماری شریعت، ہمارا کلچر، ہماری روایات، ہمارا فلسفۂ حیات ہمارے رسوم و مناسک، غرضیکہ ہر وہ شے جسے ہم اس وقت عام طور اسلام کہہ کر پکارتے ہیں، عرب ملوکیت کے دور کی پیدا کردہ ہے۔ اقبالؒ نے اس کے لئے ''عجمی اسلام'' کی اصطلاح وضع کی تھی کیونکہ یہ پیدا تو عرب ملوکیت کے زمانہ (بالخصوص دورِ عباسیہ) میں ہوا تھا لیکن تھا عجم سے مستعار لئے ہوئے تصورات کا مجموعہ۔ اسی لئے حکیم الامت نے مروجہ اسلام پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ ؎

شریعت، طریقت، تصوّف، کلام　　بتانِ عجم کے پجاری تمام

پاکستان کی تشکیل سے مقصد ان ''بتانِ عجم'' کو حریم کعبہ سے نکال کر، اسے خالصتہً ''خدا کے گھر'' میں تبدیل کرنا تھا۔ یعنی ہمارے ہاں ''جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے'' اس کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لے کر معاشرہ کو از سرِ نو مستقل اقدارِ خداوندی کے خطوط

پر متشکل کرنا۔ ان مستقل اقدار کی ہلکی سی جھلک ذیل میں پیش کی جاتی ہے:۔

حاکم و محکوم کا امتیاز:

قرآنی مملکت میں حاکم اور محکوم کا تصور نہیں ہوتا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اس مملکت کا بنیادی فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ قرآنِ کریم نے یہ فریضہ امت کے کسی خاص گروہ کا قرار نہیں دیا، بلکہ ساری کی ساری اُمت کا قرار دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (3:110)۔ تم وہ بہترین اُمت ہو جسے ہم نے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے متشکل کیا ہے۔ تمہارا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے، تقسیمِ عمل کے اصول کے مطابق، مختلف کام مختلف افراد کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں۔ گویا یہ ایک ٹیم ہوتی ہے جو باہمی تعاون سے زندگی کو اس کی منزلِ مقصود تک لے جاتی ہے۔ اس میں، افسر اور ماتحت یا حاکم اور محکوم کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ الدین، یعنی قرآنی نظام کی خصوصیت کبریٰ یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ؕ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ﴿۱۹﴾ (82:19)۔ کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر نہ کسی قسم کا کوئی کنٹرول یا حقِ حکومت رکھے، نہ کوئی کسی دوسرے کا محتاج ہو۔ اس میں تمام معاملات قوانینِ خداوندی کے مطابق طے پاتے چلے جائیں۔ اس میں کسی کو اس کا حق نہیں ہوتا کہ دوسرے سے کہے کہ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ (3:78)۔ تم میرے محکوم ہو جاؤ۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس نکتۂ شرعِ مبیں، ایں است و بس

جب عہدِ فاروقی میں روم کا سفیر مدینہ آیا اور اس نے دریافت کیا کہ تمہارا بادشاہ کون ہے، تو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طرف سے اس کا جواب یہ ملا تھا کہ مالنا ملك. بل لنا امیر۔ ہمارا بادشاہ کوئی نہیں۔ ہمارا صرف امیر ہے۔ واضح رہے کہ لفظ امیرؔ کے بنیادی معنی مشورہ کرنے والے یا راہ نمائی کرنے والے کے ہیں۔ امت، جس شخص کے سپرد یہ امانت کرتی ہے، اس کا فریضہ کیا ہوتا ہے، اس کے متعلق امت کے سب سے بڑے منتخب کردہ امیرؔ، صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے پہلے خطبہ خلافت میں، ان الفاظ میں وضاحت کر دی تھی کہ:

> یاد رکھو! تم میں سے ہر کمزور، طاقتور ہے جب تک میں اس کا حق نہ دلاؤں اور ہر طاقتور کمزور ہے جب تک اس سے کمزور کا حق نہ لے لیا جائے۔

اس فریضہ کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان الفاظ میں دہرایا تھا کہ:

> یاد رکھو! اگر کوئی شخص کسی پر زیادتی کرے گا تو میں اس وقت تک اسے نہ چھوڑوں گا جب تک اس کا ایک رخسار زمین پر ٹکا کر دوسرے رخسار پر پاؤں نہ ٹکاروں۔ تا آنکہ وہ حق کے سامنے سپر انداز ہو جائے لیکن تم میں سے حقدار کے لئے میں اپنا رخسار زمین پر رکھ دوں گا۔

خلافت اور ملوکیت میں فرق:

وہ اکثر لوگوں سے سے دریافت کرتے رہتے کہ میں کہیں خلافت سے روگردانی کر کے، بادشاہت کی طرف تو نہیں جا

رہا؟ ایک دفعہ جب انہوں نے یہی سوال دہرایا تو ایک شخص نے جواب میں کہا کہ خلافت اور بادشاہت کا فرق بڑا نمایاں ہے اس لئے اس میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں ہوسکتا کہ ہمارے ہاں خلافت ہے یا بادشاہت۔ خلیفہ تمام افرادِ معاشرہ کے حقوق کا محافظ ہوتا ہے اور بادشاہ ان کے حقوق میں ظلم اور جبر کرتا ہے۔ وہ ایک طرف سے لوٹتا ہے اور دوسری طرف (اپنے مقاصد کے لئے) خرچ کرتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ خلیفہ ہیں، بادشاہ نہیں۔

انہوں نے اپنے پہلے خطبہ میں کہا تھا کہ:

> لوگو! میرے اوپر تمہارے جو حقوق ہیں، میں ان کی وضاحت کرتا ہوں۔ تمہارا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ تمہارے اموال میں سے کوئی چیز نہ لوں۔ مگر قانونِ خداوندی کے مطابق۔ اور جو کچھ لوں‘ اس میں سے کچھ خرچ نہ کروں مگر حق کے مطابق۔

یہ بھی کہا تھا کہ

> تمہارا مجھ پر یہ بھی حق ہے کہ جب تم مہمات کے سلسلہ میں اپنے بچوں سے دور ہوجاؤ تو میں ان بچوں کا باپ بنوں۔

وہ کہا کرتے تھے کہ میری اور دیگر افرادِ معاشرہ کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پارٹی سفر کے لئے نکلے تو سب لوگ اپنے پیسے ایک شخص کے سپرد کردیں کہ وہ سفر کے سلسلہ میں ضروری اخراجات کرتا جائے اور اس کا حساب رکھے لہٰذا، مسلمانوں کے مال میں میرا حصہ اتنا ہی ہے کہ کپڑوں کے دو جوڑے۔ ایک گرمی کا اور ایک سردی کا۔ اور میرے اور میرے اہل وعیال کے لئے اتنا کھانا جو قریش کے ایک عام آدمی کی خوراک ہے۔

بیوی بچے فتنہ نہ بن جائیں:

اہل وعیال کے معاملہ میں ایک طرف قرآن نے انہیں زِيۡنَةُ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا (18:46) کہا ہے۔ انہیں آنکھوں کی ٹھنڈک قُرَّةَ اَعۡيُنٍ (25:74) کا موجب قرار دیا ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی بتا دیا ہے کہ یاد رکھو۔ اَنَّمَاۤ اَمۡوَالُكُمۡ وَاَوۡلَادُكُمۡ فِتۡنَةٌ (8:28) یہ انسان کے لئے بہت بڑی آزمائش کا موجب بن جاتے ہیں اور مقاصدِ حیات میں تمہارے سب سے بڑے دشمن اِنَّ مِنۡ اَزۡوَاجِكُمۡ وَاَوۡلَادِكُمۡ عَدُوًّا لَّكُمۡ فَاحۡذَرُوۡهُمۡ (64:14)۔ یاد رکھو! تمہاری اولاد اور بیویاں بعض اوقات تمہاری سب سے بڑی دشمن ہوتی ہیں۔'' تمہاری زندگی کے بڑے بڑے بلند مقاصد انہی کے ہاتھوں تباہ ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے تمہارے پاؤں میں ایسی لغزش آتی ہے کہ تم اپنے مقامِ بلند ورفیع سے گر کر چکنا چور ہوجاتے ہو۔ اس لئے فَاحۡذَرُوۡهُمۡ۔ ان سے بہت محتاط رہنا، قرآنی مملکت میں اس لغزش کی گھاٹی کو ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک بیوی تھی جسے ان کے مزاج میں بڑا دخل تھا۔ جب امورِ خلافت ان کے سپرد ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ امورِ مملکت میں دخیل ہوتی ہیں اور بعض اوقات غلط سفارشات کردیتی ہیں۔ جب اس

نے تنبیہ کے باوجود اپنی اس عادت کو نہ بدلا تو آپ نے اُسے طلاق دے دی۔ اولاد کے بارے میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ عراق کے گورنر (حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے ان کے دولڑکوں (جناب عبداللہ اور عبیداللہ) کو کچھ رقم خزانہ میں داخل کرنے کے لئے دی۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہم اس رقم کو قرض سمجھ کر اس سے تجارت کرلیں اور پھر اصل رقم بیت المال میں جمع کرادیں تو اس کی اجازت ہے؟ انہوں نے اجازت دے دی۔ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ اس مال کی تجارت سے جو منافع ہوا ہے وہ بھی بیت المال میں داخل کرانا ہوگا۔ بیٹوں نے کہا کہ گورنر نے انہیں اس کی اجازت دے دی تھی۔ اس پر آپ نے پوچھا کہ کیا اس نے کسی اور کو بھی اس قسم کی اجازت دی تھی یا تمہارے ہی ساتھ یہ رعایت برتی تھی۔ انہوں نے کہا کہ کسی اور کو تو اس قسم کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اس پر آپ نے کہا کہ اس نے یہ رعایت تمہیں امیر المومنین کے بیٹے ہونے کی وجہ سے دی ہے۔ اور یہیں سے فساد کی ابتداء ہوا کرتی ہے۔ قرآنی مملکت میں ایسا نہیں ہوسکتا۔ اس لئے میں اپنے فیصلے کو واپس نہیں لینا چاہتا۔ اس باب میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب وہ امہات المومنین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کو بیت المال سے کوئی چیز بطور تحفہ بھیجتے تو حضرت حفصہ کا حصہ آخر میں لگاتے کہ اگر مقدار میں کچھ کمی رہ جائے تو وہ ان کے حصہ میں ہو۔ یہ اس لئے کہ حضرت حفصہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیٹی بھی تھیں ___ قحط کے زمانے میں آپ نے گلی میں ایک بچی کو دیکھا کہ بھوک سے نڈھال ہورہی ہے۔ آپ کو اس سے بڑا صدمہ ہوا۔ کہا کہ کوئی پہچانتا ہے کہ یہ بچی کون ہے؟ بیٹا ساتھ تھا۔ اس نے کہا کہ آپ کی پوتی (فلاں) ہے۔ آپ نے کہا کہ اس کی حالت ایسی کیوں ہورہی ہے۔ اس نے کہا کہ قحط کی وجہ سے جتنا کچھ ملتا ہے اس میں یہ حالت نہ ہوگی تو اور کیا ہوگا۔؟ آپ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور کہا کہ پھر جو حال قوم کے دوسرے بچوں کا ہے وہی عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی پوتی کا ہوگا۔ تنگی ہوگی تو سب پر اور کشادگی ہوگی تو سب کے لئے۔ ان کا دستور تھا کہ

> جب مملکت میں کوئی امتناعی حکم نافذ کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کر کے ان سے کہتے کہ میں نے فلاں فلاں چیز سے منع کیا ہے۔ اور لوگ تمہاری طرف ایسے دیکھ رہے ہیں جیسے پرندے گوشت کی طرف اگر تم محتاط ہوگے تو وہ بھی رہیں گے۔ اور اگر تم میں سے کسی نے ایسا کیا تو (چونکہ ہمارے اعمال کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے) تمہیں اُن سے دگنی سزا دوں گا۔ اب تمہارا اختیار ہے، چاہے آگے بڑھو اور چاہے پیچھے ہٹو۔ (تاریخ عمر، ابن جوزی)

عدل

قرآنی مملکت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر ایک سے عدل ہوتا ہے۔ عدل کی ایک شکل یہ ہے کہ ہر متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ قانون کے مطابق کیا جائے اور اس میں کسی کی رورعایت نہ کی جائے۔ یہی ہے وہ مملکت جس میں ہر صاحبِ اقتدار سے یہ کہا جاتا ہے کہ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى

تمہیں مملکت میں صاحبِ اختیار اس لئے بنایا گیا ہے کہ تم لوگوں کے فیصلے حق کے ساتھ کرو اور اس میں اپنے جذبات کو کبھی دخیل نہ ہونے دو۔ (38:26)

یہاں کہا گیا ہے کہ لوگوں کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ حق کے ساتھ کرو۔ یہ نکتہ بڑا غور طلب ہے۔ عدل کا عام تصور یہی ہے کہ اگر معاملات کا تصفیہ ملک کے رائج الوقت قانون کے مطابق ہو تو کہا جائے گا کہ عدل کا تقاضا پورا ہو گیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر خود وہ قانون جس کے مطابق فیصلہ ہوا ہے، عدل پر مبنی نہیں تو اس کے مطابق فیصلہ کو مبنی بر عدل کیسے کہا جائے گا؟ اگر قانون کے استعمال میں جذبات اثر انداز ہو سکتے ہیں تو قانون سازی میں جذبات کیوں اثر انداز نہیں ہو سکتے! یہ وجہ ہے کہ قرآنی مملکت میں قانون سازی کا اختیار کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں تمام قوانین، اصولی طور پر، خدا کے متعین فرمودہ (قرآن کی دفتین کے اندر محفوظ) ہوتے ہیں۔ اور مملکت کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان قوامین کو اپنے زمانے کے حالات کے مطابق نافذ العمل بنائے۔ قرآنِ کریم کا تعارف سب سے پہلی آیت میں الکتاب کہہ کر کرایا گیا ہے۔ الکتاب ضابطۂ قوانین کو کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں چند ایک قوانین تفصیلی طور پر دیئے گئے ہیں اور باقی اصولی طور پر درج ہیں۔ ان اصولی قوانین کی جزئیات، ہر زمانے کی امت، اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، باہمی مشاورت سے مرتب کرے گی۔ ان جزئیات، (یا بائی لاز) میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق تغیر و تبدل ہوتا رہے گا۔ لیکن اصولی قوانین ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔ ان میں تبدیلی کا حق کسی ایک فرد یا پارلیمان تو ایک طرف، ساری دنیا کی آبادی کو بھی حاصل نہیں ہو گا۔ جو مملکت، قرآنی قوانین کے مطابق فیصلے کرے گی اسے اسلامی مملکت کہا جائے گا۔ قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾ (5:44)

جو خدا کی طرف سے نازل کردہ کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

لہٰذا، قرآنی مملکت میں ہر فیصلہ قرآنی قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ اور ان قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے میں، نہ فیصلہ کرنے والے کے ذاتی رجحانات و میلانات اثر انداز ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کے خارجی مؤثرات دخیلِ کار۔

يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾ (2:48)

اس دور میں کوئی شخص (قانون کے مقابلہ میں) کسی دوسرے شخص کے کام نہیں آ سکے گا، نہ ہی کسی کی سفارش مجرم کو بچا سکے گی۔ نہ ہی اس سے کچھ لے لوا کر اُسے چھوڑ دیا جائے گا۔ نہ ہی کوئی کسی اور طرح مجرم کی مدد کر سکے گا۔

اس میں مجرم چھپا نہیں رہ سکتا، دور سے پہچانا جا سکتا ہے يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ (55:41) ''اس میں مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے''۔ اس میں انتظام ایسا ہو گا کہ مجرم، شریف انسانوں سے بالکل الگ نظر

آئیں۔ وَامۡتَازُوا الۡيَوۡمَ اَيُّهَا الۡمُجۡرِمُوۡنَ ﴿۵۹﴾ (33:59) تاکہ کوئی شخص ایسے لوگوں سے دھوکا نہ کھا سکے۔ اس میں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی مجرم، مواخذہ سے بچ جائے یا کوئی بے گناہ یوں ہی دھر لیا جائے۔ وَلَا تَكۡسِبُ كُلُّ نَفۡسٍ اِلَّا عَلَيۡهَا ۚ (6:164) اس میں ہر شخص اپنے اعمال کے مطابق بدلہ پاتا ہے۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰى ۚ (6:164) اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

قرآنی مملکت میں، بڑی سے بڑی شخصیت بھی قانون کے دائرے سے باہر نہیں ہوتی۔ اس باب میں، اور تو اور خود حضور رسالتماب صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ اقدس سے بھی یہ اعلان ہوا کہ:

اِنِّىۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَيۡتُ رَبِّىۡ عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ ﴿۱۵﴾ (6:15)

اگر میں بھی قانون خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اس کے مواخذہ سے سخت ڈرتا ہوں۔

اور اس کے بعد فرمایا کہ اگر میری چہیتی بیٹی ــــــ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ــــــ بھی قانون شکنی کرے تو میں اسے بھی سخت سزا دوں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں مصر کے گورنر کے بیٹے نے ایک مصری کو کسی بات پر یہ کہہ کر ہنٹر سے پیٹا کہ تم بڑے آدمیوں کی اولاد سے گستاخی سے پیش آتے ہو تو آپ نے گورنر، اس کے بیٹے اور اس مصری کو مدینہ بلوا بھیجا۔ مصری کے ہاتھ میں ہنٹر دیا اور کہا کہ اسے اسی طرح مارو اور کہو کہ تم نے دیکھ لیا کہ بڑوں کی اولاد کا حشر کیا ہوتا ہے؟ اس کے ساتھ ہی اس گورنر کو بھی تادیب کی کہ اگر تم نے بیٹے کی تربیت صحیح کی ہوتی تو اس کے سر میں یہ خناس کیوں سماتا کہ وہ بڑوں کی اولاد ہے اس لئے اُسے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا حق حاصل ہے۔ خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک مرتبہ ایک عدالت میں پیش ہونے کا اتفاق ہوا تو جج نے انہیں امتیازی مقام پر بیٹھنے کی پیش کش کی۔ آپ نے اس پیش کش کو مسترد کر دیا اور مدعی کے برابر بیٹھ گئے۔ مقدمہ ختم ہونے کے بعد، آپ نے جج کو لکھا کہ تم جج بننے کے قابل نہیں ہو سکتے جب تک تم امیر المومنین اور ایک عام شہری کو یکساں نہ سمجھو۔

قرآنی مملکت میں یہ کیفیت تو عدالت کی ہوتی ہے لیکن اس میں مناسب تعلیم و تربیت سے خود افرادِ معاشرہ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر ان سے کبھی کوئی لغزش سرزد ہو جائے تو وہ خود اپنے آپ کو اپنے جرم کی سزا کے لئے پیش کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کا ایمان یہ ہوتا ہے کہ ارتکابِ جرم کا کوئی اور شاہد ہو یا نہ ہو، خود خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل سب سے بڑا گواہ ہوتا ہے۔ وہ گواہ جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ:

يَعۡلَمُ خَآئِنَةَ الۡاَعۡيُنِ وَمَا تُخۡفِى الصُّدُوۡرُ ﴿۱۹﴾ (40:19)

وہ نگاہ کی خیانت اور دل کے اندر گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہوتا ہے۔

یہی تھی وہ تعلیم جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک رات حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حسبِ دستور، افرادِ معاشرہ کے حالات کا براہِ راست مطالعہ کرنے کے لئے گشت کر رہے تھے کہ آپ نے سنا کہ ایک خیمہ کے اندر، ماں اپنی بیٹی سے کہہ رہی ہے کہ دودھ

میں تھوڑا سا پانی ملا کر اسے چولھے پر چڑھا دو۔ بیٹی نے کہا کہ امی میں دودھ میں پانی نہیں ڈالوں گی کیونکہ خلیفہ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ ماں نے جواب دیا کہ پانی ڈال دو، خلیفہ اس وقت کہاں دیکھ رہا ہے۔ لڑکی نے کہا کہ خلیفہ تو نہیں دیکھ رہا لیکن وہ خدا تو دیکھ رہا ہے جس کا حکم خلیفہ نے ہم تک پہنچایا تھا۔

خلیفہ نے گھر آ کر بیوی سے کہا کہ صبح اُس خیمہ میں جاؤ اور اس لڑکی کی ماں سے لڑکی کا رشتہ مانگ لو۔ ایسی بچی جس گھر میں آجائے گی وہ گھر نور سے بھر جائے گا۔

پہل کہاں سے ہو؟

لیکن افرادِ معاشرہ میں اس قسم کی تبدیلی اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب پہلے برسرِ اقتدار طبقہ خود اپنے کیریکٹر میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرے۔ لوگ قانون کی اطاعت کرتے ہی اس وقت ہیں جب ان کے اربابِ حل وعقد خود قانون کی اطاعت کریں۔ اسی طبقہ کے بگڑنے سے ساری قوم بگڑتی ہے اور اسی کے سنورنے سے ساری قوم سنور جاتی ہے۔ جب حضرت صالح علیہ السلام کو قومِ ثمود کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا تو آپ نے دیکھا کہ قوم تمام کی تمام بگڑی ہوئی ہے۔ اس کی اصلاح کی صورت کیا ہوگی؟ تو خدا کی طرف سے جواب ملا کہ گھبرانے کی بات کوئی نہیں ____ وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ﴿٤٨﴾ (27:48) مملکت کے مرکز میں قوم کے نُوسرغنے ہیں اور وہی سارے فساد کا موجب ہیں اور قوم کے معاملات کو سنورنے نہیں دیتے۔ اگر وہ راہِ راست پر آجائیں تو ساری قوم سنور جائے گی۔ یہی تھی وہ حقیقت جسے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:

> عوام میں اس وقت تک ٹیڑھ پیدا نہیں ہوتی جب تک ان کے لیڈر سیدھے رہتے ہیں۔ جب تک راعی اللہ کی راہ میں چلتا ہے، رعایا اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ جہاں اس نے پاؤں پھیلائے، رعایا اس سے پہلے پاؤں پھیلا دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنی مملکت میں، امیر کی اطاعت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرے۔ قرآنِ کریم سے اس باب میں واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ: وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا (18:28) جو ہمارے قوانین کو فراموش کر دے۔ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ ۔ اور اپنے مفاد اور جذبات کے پیچھے لگ جائے۔ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا ﴿٢٨﴾۔ اور یوں اس کے معاملات قاعدے اور قانون کی حدود سے تجاوز کر جائیں تو اس کی اطاعت مت کرو۔ اسی بناء پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ:

> اگر ایک ناک کٹا، سیاہ فام حبشی بھی تمہارا امیر ہو تو جب تک وہ کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے، تم اس کے حکم کو سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ (مسلم)

اسی اصول کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت میں' ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ:

تم میری اطاعت اس وقت تک کرو جب تک میں اللہ کے احکام کی اطاعت کروں۔ اگر میں اس کی نا فرمانی کروں توتم پر میری اطاعت فرض نہیں۔

اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے ان الفاظ میں دہرایا تھا کہ:

یاد رکھو! کوئی صاحبِ اختیار دنیا میں اس مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا کہ وہ اگر خدا کے قوانین کی خلاف ورزی کرے تو اس کی اطاعت کی جائے۔

یہ اس لئے کہ قرآنی مملکت میں اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی ہوتی ہے، کسی انسان کی نہیں۔ ان کا امیر ان قوانین کے مطابق معاشرہ متشکل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر وہ خود ہی ان قوانین کی اطاعت نہ کرے تو دوسرے اس کی اطاعت کس طرح کریں گے؟ یہی وجہ ہے کہ اس نظام کے داعیٔ اوّل، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمادیا کہ:

اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (6:163)۔ سب سے پہلے میں خود اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔

اس مقام پر اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ امیر کی اطاعت اس وقت تک ہے جب تک وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرے، تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر شخص کو اس کا اختیار دے دیا جائے کہ جس وقت وہ سمجھے کہ امیر نے خدا کے کسی حکم کی اطاعت نہیں کی، وہ بغاوت کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔ اس سے تو انارکی پھیل جاتی ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ قرآنی مملکت کے آئین میں اس قسم کا ضابطہ ہوگا کہ جس کی رُو سے خود امیر مملکت کے اقدامات پر نگاہ رکھی جائے گی اور جونہی وہ حد سے تجاوز کرے، آئینی اور قانونی طور پر اس کا مواخذہ ہو سکے گا۔ اور اگر وہ مجرم ثابت ہوگا تو اس کی جگہ دوسرا امیر مقرر کر دیا جائے گا۔

سوشل جسٹس:

یہ تھا عدل ___ یعنی قانون کے مطابق چلنے کا ایک گوشہ۔ اس کا دوسرا گوشہ وہ ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں عدلِ عمرانی (SOCIAL JUSTICE) کہا جاتا ہے۔ سوشل جسٹس کی اصطلاح آج کل بڑی عام ہو رہی ہے اور اس کا ہر جگہ چرچا سنائی دیتا ہے۔ لیکن اس اصطلاح کا صحیح مفہوم کیا ہے، اس کے متعلق ابھی تک متفق علیہ کچھ نہیں کہا گیا۔ یہ اصطلاح بھی، سوشلزم کی طرح، ہر ذہن میں الگ مفہوم کی حامل ہے۔ بنیادی طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس سوسائٹی کو مبنی بر عدل (JUST) کہا جائے گا جس میں ہر فرد کو وہ کچھ مل جائے جس کا وہ حقدار ہے۔ لیکن یہیں سے پھر دوسرا سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ کس طرح متعین کیا جائے کہ کوئی شخص کس چیز کا حقدار ہے۔ مختلف افراد کے حق (یا واجب DUE) کا تعین، پہلے سوال سے بھی زیادہ مشکل ہے اور اسی سے ساری پیچیدگیاں اُبھرتی ہیں۔ ایک طرف سے جواب ملتا ہے کہ ایک شخص صرف اس کا حقدار ہے جو اسے معقول اخلاقی اصولوں (VALID MORAL PRINCIPLES) کے مطابق ملے۔ لیکن یہ اخلاقی اصول کیا ہیں، یہ سوال پھر بحث طلب رہ جاتا ہے۔ اس موضوع پر جو کچھ اس وقت تک میری نظروں سے گزرا ہے اس میں (EMIL

(BRUNNER) کا پیش کردہ مفہوم میرے نزدیک قرآنی تصور کے مطابق ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل (JUST) اور فلاں ظلم پر مبنی (UNJUST) ہے، وہ درحقیقت کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین، معاہدات، رسوم ورواج سے ماوراء ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جاسکتے ہیں۔ یا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق، الوہیاتی معیار موجود ہے۔ ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا۔ جو ایک کے نزدیک قابلِ قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابلِ تسلیم۔ عدل کے لفظ سے مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حقِ مطلق ہونے کی تقدیس شامل ہوگی اور یا پھر یہ محض جھوٹے نگوں کی مینا کاری اور ملمع سازی ہوگی۔

(JUSTICE AND THE SOCIAL ORDER)

رزق کا حق:

قرآن کی رُو سے عدل کی تعریف اسی قسم کی ہے۔ یعنی کسی شخص کو وہ کچھ مِل جانا جس کا وہ ازروئے قوانینِ خداوندی حقدار ہے، عدل کہلائے گا۔ اور یہ قوانین، قرآن کے اندر موجود ہیں۔ لہٰذا، قرآن کی رُو سے سوشل جسٹس کے معنی ہوں گے ہر شخص کو اس کا قرآنی حق ادا کردینا۔ قرآنی مملکت اس قسم کے سوشل جسٹس کو عملاً بروئے کار لانے کی ایجنسی ہے۔ ان ابدی اور غیر مشروط حقوق میں قرآن نے سب سے پہلے، ہر ذی حیات کے لئے رزق کا حق شامل کیا ہے۔ رزق کے معنی ہیں تمام وہ سامان اور ذرائع جن سے انسان کی جسمانی پرورش اور اس کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے۔

اس حق کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے کہ:

وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِي الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزۡقُهَا (11:6)

سطحِ ارض پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔

قرآنی مملکت، جو خدا کے نام پر قائم ہوتی ہے، خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا فریضہ اپنے اوپر لیتی ہے۔ اس لئے تمام افرادِ معاشرہ سے واضح الفاظ میں کہتی ہے کہ:

نَحۡنُ نَرۡزُقُكُمۡ وَاِيَّاهُمۡ (6:151)

(تم معاش کی طرف سے مطمئن ہوکر بلند مقاصدِ حیات کے حصول کے لئے کوشاں رہو) ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

ہمارے ہاں یہ بحث اکثر وجہِ نزاع بنی رہتی ہے کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ وہ سرمایہ دارانہ ہے، رفاہی ہے یا اشتراکی۔ لیکن ہم اگر قرآنی مملکت کی اس عظیم ذمہ داری کو سامنے رکھیں جسے مندرجہ بالا آیت میں متعین کیا گیا ہے تو بات نکھر

کر سامنے آجاتی اور سارا مسئلہ صاف ہو جاتا۔ اسلام میں معاشی نظام کا انداز کچھ اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ وہ مقصود بالذات نہیں۔سوال سارا یہ ہے کہ وہ ذمہ داری جسے مملکت اپنے سر پر لیتی ہے وہ کس طرح کے معاشی نظام سے پوری ہو سکتی ہے۔۔۔ یعنی تمام افرادِ معاشرہ اور ان کی اولاد کے سامان زیست کی ذمہ داری۔۔۔اسی کو ایتائے زکوٰۃ کہتے ہیں۔یعنی نوعِ انسانی کو سامانِ نشو ونما فراہم کرنا، اور جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے، یہ قرآنی مملکت کے قیام کا بنیادی مقصد ہے۔ظاہر ہے کہ مملکت اتنی عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو نہیں سکتی جب تک رزق کی پیداوار کے ذرائع اس کی تحویل میں نہ ہوں۔رزق کی پیداوار کا بنیادی ذریعہ زمین ہے۔اور قرآن کی رُو سے زمین پر۔۔۔جو خدا کی طرف سے بلا مزدو معاوضہ، انسانوں کی پرورش کے لئے عطا ہوئی ہے، انفرادی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔اسے قرآن نے سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیۡنَ (41:10) قرار دیا ہے۔یعنی اسے تمام ضرورتمندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہئے۔کسی کی ملکیت میں نہیں چلا جانا چاہیے۔اسی حقیقت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ:

زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے۔اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہیے۔

اس سلسلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلا اصلاحی قدم یہ اٹھایا کہ زمینداری کے نظام کو ختم کر کے یہ فیصلہ کر دیا کہ زمین کاشتکار کے پاس رہے گی اور وہ بھی اتنی جتنی وہ خود کاشت کر سکے۔اس کے بعد جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں عراق کی وسیع وعریض زمینیں مسلمانوں کے قبضے میں آئیں تو ان کی تقسیم کے سوال پر اچھی طرح بحث ہوئی اور بالآخر فیصلہ یہ ہوا کہ انہیں افراد میں تقسیم نہ کیا جائے بلکہ مملکت کی تحویل میں رکھا جائے۔چنانچہ مملکت کی طرف سے اعلان کر دیا گیا کہ۔۔۔لَنَا رَقَابُ الْاَرْضِ۔۔۔زمین مملکت کی رہے گی تا کہ اس کے مناسب انتظام سے افراد معاشرہ کو سامانِ رزق بہم پہنچایا جا سکے۔

ربوٰ کا مفہوم:

زمین کی ملکیت یا تحویل کے بعد، سب سے اہم سوال، حصولِ دولت کا ہے۔عصرِ حاضر میں معیشت کا یہ مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ معاوضہ محنت (LABOUR) کا ہونا چاہیے، یا سرمایہ (CAPITAL) کا۔اور جس انداز سے اس سوال پر بحث ہوتی ہے۔اس سے ایسا نظر آتا ہے گویا یہ سوال دنیا کے سامنے پہلی مرتبہ آیا ہے۔حالانکہ اربابِ فکر ونظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ قرآنِ کریم نے اس سوال کو مدت ہوئی حل کر دیا تھا۔قرآن نے ربوٰ کو حرام قرار دیا ہے۔اور حرام بھی اس شدّت کا کہ اس کے لئے کہا ہے کہ ایسا کرنا خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ربوٰ کا ترجمہ ہمارے ہاں سود کیا جاتا ہے۔ اور اس ترجمہ کی بناء پہ یہ بحثیں چل نکلی ہیں کہ تجارتی سود (COMMERCIAL MERCIAL INTEREST) اور بنکوں کا سود وغیرہ جائز ہے یا نہیں۔آپ ذرا اس حقیقت پر غور کیجئے کہ قرآن نے ربوٰ کے علاوہ اور بھی بہت سی باتوں کو حرام قرار دیا ہے۔لیکن ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو مجرم قرار دیا ہے۔اس کے برعکس، ربوٰ کی یہ کیفیت ہے کہ اسے حرام قرار

دیتے ہوئے کہا کہ: وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا (2:278) ربوٰ میں سے جو کچھ کسی کے ذمے باقی ہے اسے چھوڑ دو اور اس کے بعد کہا کہ: فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (2:279) اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اسے خدا اور رسول (اسلامی نظام کی طرف سے اعلانِ جنگ سمجھ لو۔ اس سے آپ دیکھئے کہ ربوٰ اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کے ارتکاب کو نظامِ حکومت کی طرف سے اعلانِ جنگ قرار دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ربوٰ کے معنی ہیں ''سرمایہ پر بڑھوتی'' (سود تو اس کی صرف ایک شکل کا نام ہے) قرآن جس قسم کا نظام قائم کرنا چاہتا ہے اس میں سرمایہ کے معاوضہ کا اصول ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا، ربوٰ کا مرتکب، اسلامی مملکت کے اس نظام کے علی الرغم دوسرا نظام قائم کرنا چاہتا ہے اور ظاہر ہے کہ مملکت کے نظام کے خلاف دوسرا نظام قائم کرنا کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ اس لئے اسے ''خدا اور رسوں کی طرف سے اعلانِ جنگ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا، قرآنی مملکت میں ایسا نظام جس میں سرمایہ کا معاوضہ لیا جائے، حرام ہی نہیں بلکہ مملکت کے خلاف بغاوت ہے۔ اس میں معاوضہ صرف محنت کا ہوگا، سرمایہ کا نہیں ہوگا۔ خواہ اس کی کوئی شکل ہو۔ وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعٰى (53:39) یعنی انسان صرف اس کا حقدار ہے جس کے لئے وہ محنت کرے۔ اس کے نظام کا بنیادی اصول ہے۔

> اس اصول پر آج سے چودہ سو سال پہلے حجاز کی قرآنی مملکت میں عمل بھی ہو چکا ہے۔ اس میں شروع میں مالِ غنیمت کی تقسیم ہوتی تھی تو اس تقسیم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور یہ تھا کہ آپ غیر شادی شدہ کو ایک حصہ دیتے تھے اور شادی شدہ کو دگنا حصہ۔ کیونکہ اس کی ضروریات زیادہ ہوتی تھیں۔ اس کے بعد جب افرادِ مملکت کے وظائف مقرر کر دیئے گئے تو ان میں بھی یہی اصول کارفرما رکھا گیا۔ یہ اس لئے کہ تمام افرادِ معاشرہ کو رزق ـــ یعنی سامانِ زیست ـــ مہیا کرنا اس مملکت کا فریضہ تھا۔ اس میں کوئی دوسرا اصول نافذ العمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

اور یہ ظاہر ہے کہ جب سرمایہ پر کچھ وصول ہی نہیں کیا جا سکے گا تو فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) کی، جو نظامِ سرمایہ داری کی اصل و بنیاد ہے، کوئی قیمت ہی نہیں رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ضرورت سے زیادہ سب کچھ دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دے دینے کا حکم دیا ہے وَيَسْأَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۖ قُلِ الْعَفْوَ ۗ (2:219) تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کے لئے کھلا رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زیادہ ہے، سب کا سب۔ اسی کی تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث کرتی ہے جس میں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا ہے کہ:

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو رزق تجھے عطا کیا گیا ہے اسے چھپا کر نہ رکھو۔ اور اس میں سے جو کچھ تجھ سے مانگا جائے اُسے مت روکو۔ میں نے کہا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ کیسے ممکن ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یا تو ایسا کرنا ہوگا یا جہنم کا ایندھن بننا پڑے گا۔ (حاکم)

دولت کی تقسیم:

اس وقت دنیا میں اشتراکی نظام (کمیونزم) کا بڑا شہرہ ہے۔ اس نظام کا سنگِ بنیاد یہ اصول بتایا جاتا ہے۔

From each according to his capacity,
to each according to his needs.

یعنی ہر شخص سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جائے اور اس کی ضروریات کے مطابق اسے دیا جائے۔ اشتراکیت کا یہ اصول اس وقت تک محض ایک نظری اصول ہی ہے۔ اس پر عمل کہیں نہیں ہو رہا۔ جن ممالک کو اس وقت کمیونسٹ کہا جاتا ہے، ان میں بھی کمیونزم کا نظام رائج نہیں۔ سوشلزم کا نظام رائج ہے۔ اس لئے ہنوز کمیونزم کا مندرجہ بالا اصول شرمندۂ معنی نہیں ہوا[1]۔ لیکن اس اصول پر آج سے چودہ سو سال پہلے حجاز کی قرآنی مملکت میں عمل بھی ہو چکا ہے۔ اس میں شروع میں مالِ غنیمت کی تقسیم ہوتی تھی تو اس تقسیم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور یہ تھا کہ آپ غیر شادی شدہ کو ایک حصہ دیتے تھے اور شادی شدہ کو دگنا حصہ۔ کیونکہ اس کی ضروریات زیادہ ہوتی تھیں۔ اس کے بعد جب افرادِ مملکت کے وظائف مقرر کر دیئے گئے تو ان میں بھی یہی اصول کارفرما رکھا گیا۔ یہ اس لئے کہ تمام افرادِ معاشرہ کو رزق ـــــ یعنی سامانِ زیست ـــــ مہیا کرنا اس مملکت کا فریضہ تھا۔ اس میں کوئی دوسرا اصول نافذ العمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس مملکت نے ایسا معاشرہ قائم کرنا تھا جس میں کیفیت یہ ہو کہ: اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿١١٨﴾ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿١١٩﴾ (20:118-119) نہ کوئی شخص بھوک اور پیاس کی وجہ سے پریشان ہو، اور نہ ہی وہ لباس اور مکان سے محروم رہے۔ یہ ہر فرد کی کم از کم بنیادی ضروریاتِ زندگی ہیں جن سے قرآنی مملکت میں کوئی بھی محروم نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس معاشرہ میں صرف انہی بنیادی ضروریات پر اکتفا کیا جاتا ہے اور دیگر سامانِ آسائش و زیبائش سے محرومی ہوتی ہے۔ جوں جوں اس معاشرہ میں ترقی ہوتی جاتی ہے اس کا نقشہ جنتی ہوتا جاتا ہے جس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ـــــ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ (22:23)۔ نہایت اعلیٰ درجہ کے ریشمی ملبوسات۔ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ (18:31) دبیز و لطیف ریشم کے زرکار پردے۔ سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ ﴿١٥﴾ (56:15) مرصع اور نرم و نازک صوفے۔ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا ﴿١٥﴾ (76:15) چاندی کے برتن اور بلورین آب خورے۔ غرضیکہ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا ﴿٢٠﴾ (76:20)۔ عظیم مملکت اور اس میں سامانِ آسائش نہایت فراواں۔ اور پھر یہ سامانِ آسائش و آرائش کسی خاص طبقہ کے لئے مخصوص نہیں ہوگا۔ بلکہ ہر فردِ معاشرہ کے لئے یکساں۔ قرآن میں آپ شروع سے آخیر تک دیکھ جایئے۔ اس میں کہیں یہ نہیں لکھا ملے گا کہ جنتی زندگی کی یہ آسائشیں ایک خاص طبقہ کے لئے ہوں گی اور عوام ان سے محروم رہیں گے۔ قرآنی مملکت کے جنتی معاشرہ میں یہ تمام سامان ہر ایک کو میسر ہوگا۔ اس میں سب کا معیارِ زندگی اتنا بلند ہوگا۔ جنت کا کوئی گوشہ جہنم نہیں ہو سکتا۔

دنیا میں آپ عام اخلاقی برائیوں پر غور کیجئے۔ ان کے اولین سرچشمے دو ہی نظر آئیں گے۔ یعنی یا افراطِ زر یا افلاس

---

[1] روس اور چین اب پلٹ کر نظامِ سرمایہ داری کی طرف آ رہے ہیں۔

ونکبت۔ افراطِ زر سے سرکشی وطغیانی کے فساد انگیز معائب ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اور نکبت و افلاس سے پستی و دنائت کے انسانیت کش عیوب و ذمائم۔ جب قرآنی مملکت کے جنتی معاشرہ میں نہ افراط زر ہو گا نہ افلاس و زبوں حالی، تو ظاہر ہے کہ اس میں، ان سے پیدا ہونے والے عیوب و ذمائم کا بھی وجود نہیں ہو گا۔ حسد، کینہ، انتقام، تنگ نظری، حرص، ہوس، فریب کاریاں، مکاریاں، سازشیں ـــــ اور دوسری طرف بے حمیتی، بے غیرتی، ذلتِ نفس، تملق، خوشامد، منافقت وغیرہ۔ یہ سب عیوب معاشرتی ناہمواریوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب یہ ناہمواریاں مٹ جائیں تو ان، وجۂ ننگِ انسانیت بدنہادیوں اور بد لگامیوں کا بھی وجود باقی نہیں رہتا۔ اس معاشرہ کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ: لَا يَسۡمَعُوۡنَ فِيۡهَا لَغۡوًا وَّلَا تَاۡثِيۡمًا ﴿۲۵﴾ (56:25) اس میں نہ لغویت اور بیہودہ پن ہوتا ہے، نہ کوئی ایسی حرکت جس سے کسی کے دل میں افسردگی و اضمحلال پیدا ہو۔ اِلَّا قِيۡلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿۲۶﴾ (56:26) اس میں ہر طرف سے سلامتی کو نشید دلنواز و آہنگِ روح افروز سنائی دیتی ہے۔ وَنَزَعۡنَا مَا فِىۡ صُدُوۡرِهِمۡ مِّنۡ غِلٍّ (7:43) ان کے سینے تمام ایسی کثافتوں سے پاک وصاف ہوں گے جنہیں انسان، غلط معاشرہ میں دل میں چھپائے رکھتا ہے۔ اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہو گی جسے ایک دوسرے سے چھپانے کی ضرورت پڑے۔ تکریمِ انسانیت اور احترامِ آدمیت وہاں کا عام اندازِ نگاہ ہو گا۔ وہاں نہ کوئی کسی کو ذلیل سمجھے گا نہ ذلیل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس معاشرہ کا انداز وہ ہو گا جس کا نقشہ اقبالؒ نے (جاوید نامہ میں) ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ؎

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش | خوب رُوی و نرم خوئے و سادہ پوش
فکرِ شاں بے درد و سوزِ اکتساب | راز دانِ کیمیائے آفتاب!
کس ز دینار و درم آگاہ نیست | ایں بتاں را در حرمہا راہ نیست
خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر | کار ہا را کس نمی سنجد بزر
سخت کش دہقاں چراغش روشن است | از نہابِ دہ خدایاں ایمن است
کشت و کارش بے نزاعِ آبجو | حاصلش بے شرکتِ غیرے از اُوست
اندراں عالم نہ لشکر نی قشوں | نے کسے روزی خورد از کشت و خوں
نے قلم در مرغدیں گیرد فروغ | از فنِ تحریر و تشہیرِ دروغ
نے بیازاراں ز بے کاراں خروش | بے صدا ہائے گدایاں دردِ گوش

آخر میں اقبالؒ نے اس تمام تفصیل کو ایک شعر میں اس طرح سمٹا دیا ہے کہ اس کے بعد اس سلسلہ میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یعنی قرآنی مملکت وہ ہے کہ؎

کس دریں جا سائل و محروم نیست | عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمۡ فَاعۡبُدُوۡنِ ﴿۹۲﴾ (21:92)۔ اوپر ایک خدا جس کی اطاعت کا قلادہ

زیبِ گلو اور نیچے ساری اُمت ایک صف میں دوش بدوش ایستادہ۔ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ يُّؤۡتِيَهُ اللّٰهُ الۡكِتٰبَ وَالۡحُكۡمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوۡلَ لِلنَّاسِ كُوۡنُوۡا عِبَادًا لِّىۡ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ (2:79) اس میں کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا خواہ اسے ضابطۂ قوانین اور حکومت، حتیٰ کہ نبوت بھی کیوں نہ مل جائے کہ لوگوں کو اپنا محکوم بنائے اور ظاہر ہے کہ کسی کو محکوم بنانے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اسے محتاج بنا دیا جائے۔ جب قرآنی مملکت میں کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوگا تو وہ کسی کا محکوم کس طرح سے ہوگا۔

اس قرآنی معاشرہ کی تشکیل کی ابتداء خود اربابِ نظم ونسق کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول، قولِ فصیل کا حکم رکھتا ہے کہ

اگر میں پیٹ بھر کر کھڑا ہو جاؤں اور دیگر افرادِ معاشرہ بھوکے ہوں تو اس کے ایک ہی معنی ہیں کہ میں عوام کا اچھا رکھوالا نہیں ہوں۔ خدا کی قسم! اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا مر جائے تو عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے اس کی بھی باز پُرس ہوگی۔

اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی کہ:

جس بستی میں کسی ایک شخص نے بھی رات بھوکے بسر کی تو اس بستی سے خدا کی حفاظت کا ذمہ ختم ہو جاتا ہے۔

اسی لئے قرآنی مملکت کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ اگر کسی بستی میں کوئی شخص بھوک سے مر جائے تو اس بستی کے باشندوں کو اس کا قاتل سمجھا جاتا ہے اور ان سے اس کا خون بہا وصول کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ قرآنی مملکت کا یہ نظام اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے اور بہ حسن وخوبی چل سکتا ہے، جب اس کے عمال (کارندے) دیانتدار اور قابل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بار بار اس قسم کی تاکیدی ہدایات جاری کرتے رہتے تھے کہ

یاد رکھو! جس شخص کے سپرد امت کا کوئی اقتدار ہوا۔ اور پھر اس نے قابلیت کے بجائے اپنی محبت یا قرابت کی بنا پر کسی کو مسلمانوں کا حاکم بنا دیا تو اس نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے غداری کی۔

اس باب میں ان کی احتیاط کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایئے کہ انہیں ولایت کوفہ کے لئے ایک خاص ٹائپ کے کارکن کی ضرورت تھی جو بسیار کوشش کے باوجود مل نہیں رہا تھا۔ ایک شخص نے ان سے کہا کہ میں ایک ایسے آدمی کو جانتا ہوں جو ان خوبیوں کا مالک ہے، آپ اسے منتخب کر لیں۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ اس نے کہا کہ آپ کا بیٹا___ عبداللہ___ یہ سنکر انہوں نے کہا کہ قاتلک اللہ۔ خدا تجھے غارت کرے۔ تو مجھے یہ کس قسم کا مشورہ دے رہا ہے؟ عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیشک ان خوبیوں کے مالک تھے۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس کا احساس تھا کہ اگر اس کی طرح پڑ گئی تو اس کا انجام کس قدر تباہ کن ہوگا۔ مملکت کے مناصب، اربابِ اقتدار کے اعزہ و اقارب میں بٹنے لگ جائیں گے۔ وہ عمالِ حکومت کو تاکیداً لکھتے رہتے تھے کہ:

سخت کوشی کی زندگی بسر کرنے کے عادی بنو۔ موٹا جھوٹا کھاؤ، گاڑھا گزی پہنو، پرانے کپڑے استعمال کرو۔

سواریوں کو خوب چارہ دو۔ ڈٹ کر گھوڑے کی سواری کرو اور جم کر تیر اندازی کرو۔

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ میں جو ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں حکومت کا کوئی کارندہ بددیانت اور رشوت خور نہیں تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس قسم کے معاشی نظام میں کسی کو بددیانت بننے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ بددیانتی اور رشوت خوری کی ابتداء تو اس سے ہوتی ہے کہ حکومت کے ملازمین کو اپنے مستقبل کے متعلق ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا ہے۔ یہ عدمِ تحفظ (INSECURITY) کا احساس اور خدشہ ہے جو انہیں زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ اس کی ابتداء تو اس سے ہوتی ہے اور اس کے بعد، زراندوزی کی ہوس انہیں آگے ہی آگے لئے چلی جاتی ہے۔ قرآنی مملکت کے نظام میں عدم تحفظ کا خیال تک نہیں پیدا ہو سکتا۔ اس میں تمام افرادِ مملکت اور ان کے بچوں کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے۔ اس لئے کسی کو اس کی فکر ہی نہیں ہوتی کہ کل کو میرا یا میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا۔ اور نہ ہی اس میں جائدادیں کھڑی کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس نظام میں کوئی شخص بددیانت ہو نہیں سکتا۔ اسے بددیانت ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

محیر العقول کارنامے:

اگلے دنوں میرے ایک فوجی دوست نے مجھ سے پوچھا کہ قرنِ اوّل میں مسلمان سپاہیوں، (مجاہدین) نے جو محیر العقول کارنامے کر دکھائے تھے، اس کی بنیادی وجہ کیا تھی؟ میں نے کہا کہ ذرا اس پر غور کیجئے کہ وہ کون سے اسباب و احساسات ہیں جن کی وجہ سے ایک سپاہی میدانِ جنگ سے بھاگ جاتا یا کمزوری دکھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں پہلا احساس یہ ہوتا ہے کہ میں مر جاؤں گا۔ اور دوسرا احساس یہ کہ میرے بعد میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا؟ وہ تباہ ہو جائیں گے۔ قرآن نے یہ تصور دیا کہ موت صرف نقلِ مکانی کا نام ہے۔ کوئی انسان موت سے ختم نہیں ہو جاتا۔ وہ زندہ رہتا ہے۔ بس صرف مکان کی تبدیلی ہوتی ہے۔ (اسی لئے ہمارے ہاں موت کے لئے انتقال کا لفظ رائج تھا جو اس تصور کی ٹھیک ترجمانی کرتا تھا)۔ مسلمان سپاہی کے دل میں یہ تصورؑ ایمان کی حیثیت لئے ہوتا ہے اس لئے اُسے موت کا ڈر ہی نہیں ہوتا۔ باقی رہا یہ دھڑکا کہ میرے مرنے کے بعد میری بیوی بچوں کا کیا ہوگیا تو اس کی ذمہ داری پہلے ہی سے مملکت نے لے رکھی ہوتی ہے۔ لہٰذا، اسے یہ غم بھی نہیں ستاتا۔ اب سوچئے کہ جس سپاہی کو نہ موت کا ڈر ہو اور نہ ہی اپنے پسماندگان کے مستقبل کی طرف سے کسی قسم کا تردد۔ اس کے زورِ بازو کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ اس کی تو نگاہ سے (اقبالؒ کے الفاظ میں) تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اگر روٹی کی فکر سے آزاد کر دیا جائے تو وہ ''جن'' بن جاتا ہے۔ اس کی وہ صلاحتیں جو اس سے پہلے، چکی کے اس پاٹ (MILL STONE) کے نیچے بُری طرح سے دبی اور کچلی رہتی ہیں، اس طرح اُبھر کر باہر آتی ہیں کہ وہ کچھ اور کی اور مخلوق بن جاتا ہے۔ وہ صحیح انسانی پیکر میں سامنے آتا ہے۔ اس کی عظمتِ انسانیت چھلک کر باہر آجاتی ہے۔ اس کی ممکناتِ زندگی ایک ایک کر کے محسوس پیکر اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ وہ کچھ کر کے دکھا دیتا ہے جسے عام سطح کا انسان معجزات اور کرامات سمجھتا ہے۔ حالانکہ وہ نہ کوئی معجزہ ہوتا ہے نہ کرامت۔ روٹی کے چکر میں پھنسا ہوا انسان کبھی انسانی سطح پر نہیں آسکتا۔ اسے کسی انسانی مسئلہ کی

طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے جو قرآن کریم نے حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام سے کہا کہ:

يَاأَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا ط (23:51)

اے ہمارے رسولو! خوشگوار رزق کھاؤ اور اعمال صالح کرو۔

آپ نے غور فرمایا کہ اعمالِ صالح اور روٹی کا کس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے۔ میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ یہ جو ہمارے ہاں ایک مذہبی افسانہ مشہور ہے کہ ابلیس نے آدم کو دانۂ گندم کھلا دیا جس سے وہ جنت سے باہر نکال دیا گیا تو اس سے کسی سیانے نے اسی طرف اشارہ تو نہیں کیا کہ انسان کو جنت سے نکلوانا مقصود ہو تو اپنی روٹی کی فکر میں الجھا دو۔ اس کی تائید خود قرآن سے بھی ہوتی ہے۔ اس نے قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں بتایا ہے کہ آدم جس جنت میں رہتا تھا وہاں اسے روٹی کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہاں اس کی کیفیت یہ تھی کہ ــــــ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ص (2:35) وہ جہاں سے جی چاہتا پیٹ بھر کر کھا لیتا۔ اس سے کہا گیا کہ یاد رکھو! اگر تم ابلیس کے فریب میں آ گئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ: فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى (20:117)۔ تو وہ تمہیں اس جنتی زندگی سے نکلوا دے گا۔ اور تمہیں اسی روٹی کی خاطر جگر پاش مشقتیں اٹھانی پڑیں گی۔ انسان اس کے فریب میں آ گیا۔ جس کا نتیجہ سرمایہ دارانہ نظام تھا۔ اس سے بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (2:36)۔ کی انسانیت سوز جہنم وجود میں آ گئی جس میں ہر فرد کا مفاد دوسرے فرد کے مفاد سے ٹکرانے لگا۔ انسان کو اس جہنم سے نکالنے کے لئے، آسمانی راہنمائی کا سلسلہ شروع ہوا۔

*****

بعثت نبی اکرم کا مقصد

قرآنِ کریم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے کہ: وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلٰلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ط (7:157)۔ یہ ان زنجیروں کو توڑ ڈالے گا۔ جن میں انسانیت جکڑی ہوئی تھی اور اس کے سر سے ان سلوں کو اتار پھینکے گا جن کے نیچے دہ بُری طرح دبی ہوئی تھی۔ ان زنجیروں میں سب سے زیادہ کڑی اور ان سلوں میں سب سے زیادہ بوجھل وہ خوف و ہراس تھا جو ''روحانی'' قوتوں کے نام سے انسان کے اعصاب پر سوار چلا آ رہا تھا۔ اس سے اس میں جس قسم کی نفسیاتی الجھنیں (COMPLEXES) پیدا ہوتی تھیں۔ ہماری علمی دنیا اب اُن سے اچھی طرح روشناس ہو چکی ہے۔ قرآنِ کریم نے ختمِ نبوت کے اعلان سے اس سارے بوجھ کو الگ کر کے رکھ دیا۔ اس نے کہا کہ اب کوئی انسان کسی دوسرے انسان سے آ کر یہ نہیں کہہ سکے گا کہ میں آسمان سے آیا ہوں، اور تم زمینی مخلوق ہو [1]۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر کہ أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (18:110) اس باب میں سبقت کی۔

---

[1] ختمِ نبوت کے بعد ''آسمانی آواز'' قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ جو قیامت تک تمام نوعِ انسانی کے لئے مکمل ضابطۂ ہدایت ہے۔ اس کے علاوہ اب کوئی خدائی اتھارٹی نہیں بن سکتا۔

اب کوئی مافوق الفطرت عنصر، یا جسے عام طور پر روحانی قوت کہا جاتا ہے۔ انسانی زندگی پر اثر انداز نہیں ہوسکتی۔ اس سے انسانی صلاحیتوں کو ابھرنے اور نشوونما پانے کا کلی امکان حاصل ہوگیا۔ اور انسان کو پرکھنے کا معیار، شرفِ انسانیت (یعنی اس کی انسانی صلاحیتوں کی سطح) قرار پا گیا۔ اس حقیقت کو قرآنی معاشرہ کے اربابِ فکر وعمل کیسے اچھی طرح سمجھے ہوئے تھے، اس کا اندازہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیش کردہ اس معیار سے لگایئے جو ہمیں تاریخ کے صفحات میں محفوظ ملتا ہے۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایک دفعہ کوئی شخص آپ کے سامنے کسی مقدمہ میں پیش ہوا۔ آپ نے اس سے کہا کہ تم کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو تمہیں اچھی طرح جانتا ہو۔ وہ ایک آدمی کو لایا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے پوچھا کہ کیا تم اس شخص کو اچھی طرح جانتے ہو۔ اُس نے کہا، ہاں۔ تو آپ نے پوچھا کہ کیا تم کبھی اس کے پڑوس میں رہے ہو، اور اس کی اندر باہر کی زندگی سے واقف ہو۔ اس نے نفی میں جواب دیا۔ تو آپ نے کہا کہ تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے، اُس کا جواب بھی نفی میں ملا۔ تو آپ نے کہا کہ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ لین دین کا معاملہ کیا ہے؟ اس نے اس سے بھی انکار کیا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو کچھ فرمایا وہ اس نکتہ کی اچھی طرح حقیقت کشائی کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ:

پھر یوں نظر آتا ہے کہ تم نے اسے مسجد میں کھڑے کبھی سر جھکاتے اور سر اوپر اٹھاتے ہی دیکھا ہے۔

اس نے اقرار کیا تو آپ نے کہا کہ "چلے جاؤ۔ تم اسے خاک نہیں جانتے۔" اور اس شخص سے کہا کہ تم کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو تمہیں انسان کی حیثیت سے جانتا ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم کی عطا فرمودہ نئی اقدار! اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عدیم المثال عمل نے، انسانیت کے ماپنے کے کس قدر نئے پیمانے عطا کر دیئے تھے۔۔ یہ وہ پیمانے تھے جن کی رُو سے انسان کی قدر و قیمت اس کی انسانی صلاحیتوں کی بناء پر متعین ہوتی تھی۔ اور ان صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقعہ ان اقدار کی رُو سے ملتا تھا۔

نہ خوف نہ حزن:

وہ دوسری سلیں جنہوں نے انسان کو بُری طرح کچل رکھا تھا، چکی کے پاٹ تھے۔ یعنی روٹی کی فکر ــــ قرآنی مملکت نے انسان کو اس فکر سے آزاد کرکے، اس محبوسِ قفس طائر لاہوتی کو آزادی کی حقیقی فضاؤں میں اِذن بال کشائی دے دیا۔ جس سے اُسے اپنی منزل آسمانوں میں نظر آنے لگی۔ قرآنِ کریم نے قرآنی مملکت کی خصوصیت کبریٰ یہ بتائی ہے کہ اس میں افرادِ معاشرہ کی کیفیت یہ ہوگی کہ ــــ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۶۲﴾ (10:62) انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔ یعنی وہ ہر قسم کے خوف اور حزن سے مامون ہوں گے۔ خوف کے معنی تو ہم سمجھتے ہیں۔ کسی آنے والے خطرے کے احساس سے ہراساں ــــ قرآنی مملکت میں کس قدر بے خوفی اور امن ہوتا ہے، اس کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں ایسا نظام قائم کروں گا جس میں حالت یہ ہوگی کہ یمن سے ایک عورت تنہا، صحراؤں اور بیابانوں سے سفر کرتی ہوئی شام تک چلی جائے گی اور اسے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا۔ بے خوفی اور امن کے ماپنے کا اس سے بہتر پیمانہ اور کیا ہوسکتا ہے۔ باقی

ملک بھر میں تقاریب بیادِ علامہ پرویز علیہ الرحمہ

بزمہائے طلوعِ اسلام منگورہ' سوات و ایبٹ آباد

منعقدہ مورخہ: 23 فروری 2025ء

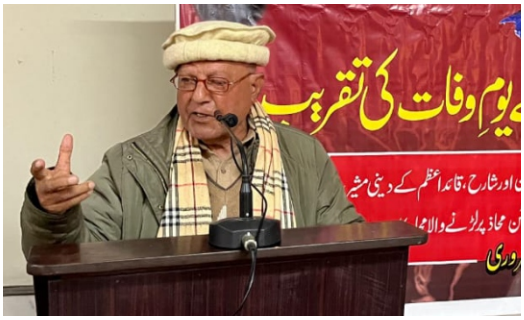

بزم طلوع اسلام لاہور

بزمِ طلوعِ اسلام ڈی ایچ اے کراچی

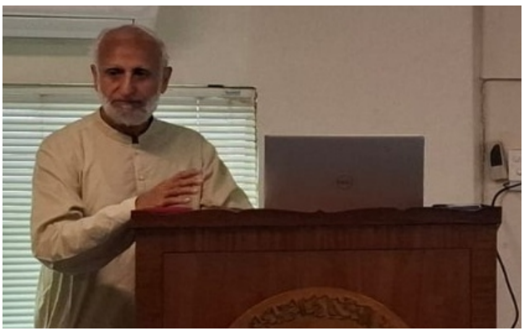

بزمِ طلوعِ اسلام فیصل آباد

بزمِ طلوعِ اسلام جلال پور جٹاں

بزمِ طلوعِ اسلام راولپنڈی

بزمِ طلوعِ اسلام پنج کسی

رہا وہ خوف جو زیردستوں کو بالا دستوں کی طرف سے ہر وقت وجۂ سوہانِ روح ہوتا ہے، سو اس کے متعلق وہ واقعہ سامنے لائیے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دفعہ ایک وادی میں سے گزر رہے تھے کہ آپ نے یکا یک سواری کو روکا، نیچے اُترے اور سجدے میں گر گئے۔ رفقاء نے پوچھا کہ آپ نے یہ کیا کیا تو فرمایا کہ یہ وہ وادی ہے جس میں عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اپنے باپ کے اونٹ چرایا کرتا تھا۔ اور سہمے سہمے پھرا کرتا تھا۔ باپ بھی سخت تھا اور یونہی بات بات پر پیٹ دیا کرتا تھا۔ ایک وہ دن تھا، اور ایک یہ دن ہے کہ عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اور اس کے خدا کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں جس سے ڈرا جائے۔ یہ وادی دیکھ کر مجھے یہ احساس اس شدت سے ہوا کہ میں بے اختیار بحضور رب العزت سجدہ میں گر گیا۔

یہ ہوتا ہے قرآنی مملکت میں بے خوفی کا عالم۔ اس میں، خدا اور بندے کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہوتی۔ جس سے ڈرا جائے۔ اور خدا کا ڈر بھی کسی مستبد حاکم کا ڈر نہیں ہوتا۔ خدا کے ڈر سے مراد ہوتا ہے اس نقصان اور تباہی کا احساس جو قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ مثلاً جس طرح ہم دریا کے کنارے چلتے ہوئے، پاؤں پھسلنے کے انجام سے ڈرتے ہیں۔ قرآنی مملکت میں قانون شکنی کے نقصان رساں نتائج کے احساس کے سوا کسی قسم کا خوف کسی کو نہیں ستاتا۔

باقی رہا حزن، تو یہ لفظ بڑے گہرے معانی کا حامل ہے۔ عام طور پر اس کے معنی افسردگی اور اندوہ ناکی ہوتے ہیں۔ خواہ اس کی وجہ کچھ بھی ہو۔ لیکن اسے بالخصوص اس افسردگی اور غمگینی کے لئے بولا جاتا ہے۔ جو معاشی پریشانی کی وجہ سے حائل ہو۔ سورۂ فاطر میں جنتی معاشرہ میں بسنے والوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ آئیں گے کہ: اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَذۡہَبَ عَنَّا الۡحَزَنَ ؕ (35:34)۔ کس قدر قابل حمد وستائش ہے خدا (کا وہ نظام) جس نے تمہیں حزن سے نجات دلائی۔ عربی زبان کے مستند لغت، تاج العروس میں لکھا ہے کہ یہاں حزن کے معنی ہیں صبح وشام کے کھانے کی فکر۔ اس کی تشریح خود اگلی آیت نے کردی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ: الَّذِیۡۤ اَحَلَّنَا دَارَ الۡمُقَامَۃِ مِنۡ فَضۡلِہٖ ۚ لَا یَمَسُّنَا فِیۡہَا نَصَبٌ وَّ لَا یَمَسُّنَا فِیۡہَا لُغُوۡبٌ ﴿۳۵﴾ (35:35)۔ وہ خدا جس نے اپنے فضل وکرم سے ہمیں ایسا معاشرہ عطا کردیا ہے جس میں نہ کوئی جگر پاش مشقت ہے، نہ ذہنی کاوش ونفسیاتی افسردگی۔ نہ اس میں روٹی کے لئے مارے مارے پھرنا پڑتا ہے اور نہ ہی باہمی معاملات میں اس قسم کا الجھاؤ پیدا ہوتا ہے جس سے انسان خواہ مخواہ پریشان رہے ___ فکرِ معاش کی طرف سے آسودگی اور باہمی خوش معاملگی، یہ ہیں قرآنی مملکت کی بنیادی برکات وحسنات۔

قرآنِ کریم (میں سورۃ الفاتحہ) کی ابتداء اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۙ﴿۱﴾ (1:1) سے ہوتی ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا درخورِ حمد وستائش اس لئے ہے کہ وہ کائنات کی نشوونما کرتا ہے۔ اور قرآن کی آخری سورت میں ربّ الناس کہا گیا ہے۔ یعنی پوری نوعِ انسانی کو سامانِ نشوونما بہم پہنچانے والا۔ جیسا کہ شروع میں بتایا جا چکا ہے، انسانی دنیا میں خدا کی یہ ذمہ داری اس مملکت کے ذریعے پوری ہوتی ہے جو اس کے نام سے قائم کی جاتی ہے۔ یہ مملکت بھی اس لئے مستحق حمد وستائش ہوتی ہے کہ یہ افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرتی ہے اور ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کا انتظام کرتی ہے۔ اگر وہ

ایسا نہیں کرتی تو قطعاً مستحقِ تعریف وتوصیف قرار نہیں پا سکتی۔ یہ وجہ ہے کہ قرآنی مملکت کے اربابِ بست وکشاد ہمیشہ اس فریضہ کی ادائیگی میں مصروفِ تگ وتاز رہتے ہیں۔ وہ سزاوارِ حمد وستائش قرار ہی اس وقت پاتے ہیں جب وہ یہ کچھ کر کے دکھائیں۔ ان کے برعکس، دوسرے اربابِ اقتدار کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ: وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا (3:187)۔ان کی ہر وقت یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کی تعریف ان کاموں کی بناء پر کی جائے جنہیں وہ سرانجام نہیں دیتے۔ قرآنی مملکت میں ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔اس میں یہ لوگ سب کچھ کر کے بھی کسی صلہ کی توقع یا ستائش کی تمنا نہیں رکھتے۔اگر کوئی بے ساختہ ان کا سپاس گزار ہونا بھی چاہتا ہے تو وہ اس سے کہہ دیتے کہ: لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (76:9)۔ ہم تم سے کسی معاوضہ کے تو ایک طرف، شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں۔

قرآنی مملکت کی خصوصیات کی تفصیل اتنی طویل ہے کہ اسے ایک نشست میں ختم نہیں کیا جاسکتا اس لئے میں آخر میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول کو پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں جو میرے نزدیک اس باب میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ہم میں سے جب بھی کسی شخص کو کوئی شکایت ہوتی ہے تو وہ کسی ایسے دروازے کو تلاش کرتا ہے جس پر دستک دینے سے اس کی شکایت رفع ہو سکے اور جب وہ دنیا کے تمام دروازوں کو بند پاتا ہے تو مجبور ہو کر اپنے خدا سے فریاد کرتا ہے۔اسے دعا کہتے ہیں۔حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک خطبۂ عام میں کہا تھا کہ:

لوگو! مجھے اللہ نے اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو اس تک پہنچنے سے روک دوں۔

یعنی ایسا انتظام کر دوں کہ اوّل تو تمہیں کسی بات کے لئے خدا کے ہاں فریاد کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے اور اگر کبھی ایسا ہو جائے تو قبل اس کے کہ تمہاری شکایت خدا تک پہنچے، اس کا ازالہ ہو چکا ہو۔ یہ ہے قرآنی مملکت کی بنیادی خصوصیت اور یہی وہ امامتِ کبریٰ ہے جس کے حصول کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔امامت (لیڈرشپ) اس لئے کہ اس قسم کی مملکت کا وجود دنیا میں کہیں نہیں تھا۔ اس لئے پاکستان کی تشکیل سے یہ سبقت وامامت اسی کے حصہ میں آنی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان کا تصور دینے والے (اقبالؒ) نے، یہ تصور دیتے ہوئے کہا تھا کہ ؎

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد　　مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

پاکستان، اسی عالم افروز اور انسانیت ساز تصور کا حسین وجمیل پیکر بننے کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔لیکن

اور یہ ''لیکن'' ایک داستان ہے جگر گداز، اور ایک حدیث ہے دلخراش۔ اگر میں نے اسے بیان کرنا شروع کر دیا تو مجھے ڈر ہے کہ آپ یہ نہ کہہ دیں کہ ؎

پھر چھیڑا حُسن نے اپنا قصہ　　لو آج کی شب بھی سو چکے ہم

اس لئے میں اس خوابِ رُبا قصہ کی تفصیل میں جانے کی بجائے، اسے قرآن کے الفاظ میں کیوں نہ پیش کر دوں جن میں اختصار اور جامعیت معجزانہ حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ آپ سورۃ الاعراف کی آیت نمبر: 175 سامنے لائیے جہاں سے بات کا

آغاز اس طرح کیا گیا ہے کہ:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ (7:175)

تم انہیں اس شخص کی عبرت آموز داستان (تمثیلاً) سناؤ جسے ہم نے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے تمام نشاناتِ راہ عطا کر دیئے تھے۔لیکن وہ انہیں چھوڑ کر یوں الگ ہو گیا جیسے سانپ اپنی کینچلی سے نکل جاتا ہے کہ اُس پر اس کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہتا۔ ایسا اس لئے ہوا کہ وہ اپنے ذاتی مفادات کے حصول اور پست جذبات کی تسکین کے پیچھے لگ گیا۔ اور یوں راہ سے بے راہ رو ہو گیا۔

ہم چاہتے تھے کہ وہ آسمان کی بلندیوں تک پہنچ جائے۔لیکن وہ زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک کر رہ گیا۔ انفرادی مفاد پرستیوں کا نتیجہ یہی ہوا کرتا ہے۔ ان ہولناکیوں سے اس کی مثال کتے کی سی ہو گئی کہ اسے اُکساؤ اور دوڑاؤ۔ تو بھی وہ ہانپے اور زبان لٹکائے اور ویسے چھوڑ دو تو بھی ہانپے اور زبان لٹکائے۔ اس کا ہونکنا کسی صورت میں کم ہی نہ ہو۔

ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ ــــ یہ حالت ہو جاتی ہے اس قوم کی جو ہمارے قوانین کا زبانی اقرار تو کرتی ہے لیکن عملاً انہیں جھٹلاتی ہے ــــ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝١٧٦ ــــ تم انہیں ان کی یہ داستان سناؤ۔ شاید یہ اس پر غور و فکر کریں اور سوچیں ہمارا ایسا حال کیوں ہو گیا؟ سَاۗءَ مَثَلَا الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا۔ اُف! کس قدر بُری حالت ہو جاتی ہے اُس قوم کی جو ہمارے قوانین کی عملاً تکذیب کرتی ہے۔ اس میں ہر ظلم و زیادتی کرنے والا سمجھتا ہے کہ میں دوسروں کو لوٹ کر اپنا فائدہ کر رہا ہوں۔ لیکن نہیں سوچتا کہ ــــ وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ۝١٧٧ (7:177)۔ وہ اس طرح کسی دوسرے کا نہیں، خود اپنا ہی نقصان کر رہا ہے۔ جذبات پرستی کے طوفان میں غرق ہونے سے ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ:

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ۔ وہ سینے میں دل رکھتے ہیں لیکن ان سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ۔ وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ۔ ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن انہیں کچھ سنائی نہیں دیتا۔ اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ۔ تم انہیں انسان سمجھتے ہو؟ نہیں۔ یہ انسان نہیں، حیوان ہیں ــــ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ۔ نہیں! یہ تو ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝١٧٩ (7:179)۔ حیوان اپنی زندگی کے تقاضوں سے کبھی غافل نہیں ہوتا۔ اور ان انسان نما حیوانوں کو خبر ہی نہیں کہ ان کی زندگی کے تقاضے کیا ہیں اور یہ کس طرف جا رہے ہیں۔

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا　　　مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

(جنوری 1967)

ڈاکٹر اعجاز رسول

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

سیکولرزم اور ہماری نئی نسل

آج ساری دنیا میں حکومتیں سیکولرزم کے نظریہ پر ہی کام کر رہی ہیں۔ سیکولرزم کے اندر خالص انسانی قوانین پر نظامِ حکومت قائم ہوتا ہے اور مذہب کو کسی قسم کا دخل نہیں ہوتا۔ لیکن مذہب کے معاملات انسان کے ذاتی عقائد اور اُس کی رسومات تک محدود کر دیئے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود مذہبی آبادی کا اثر ورسوخ ضرور نظامِ حکومت پر قائم رہتا ہے کیونکہ یہ سب جمہوریت کے حوالے سے ووٹ وغیرہ میں حصہ لیتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا کہ مذہب کا اثر ورسوخ بالکل ختم ہو جاتا ہے صحیح نہیں ہوگا۔

ہماری نئی نسل کے حوالے سے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ یہ نسل جو کہ سیکولرزم کے نیچے تعلیم و تربیت حاصل کر رہی ہے لامحالہ اسی نظریہ کو سمجھے گی اور اپنائے گی۔ اس کے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہے اور اگر انسان کے پاس ایک ہی راستہ سامنے ہو تو اختیار اور ارادہ کے استعمال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو چیز مذہب کے نام پر ان کو پیش کی جاتی ہے وہ کسی بھی سوچنے اور سمجھنے والے انسان کو اپیل نہیں کرتی۔ پھر زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے مذہب کے عقیدے اور رسومات کوئی مدد نہیں دے سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ مذہبی حضرات دعاؤں وغیرہ پر انحصار کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی عمل پر بھی زور دیتے ہیں کیونکہ صرف دعا سے مسئلہ حل نہیں ہوتا تو بادلِ نخواستہ اُٹھ کر عمل بھی کرتے ہیں۔ لیکن پڑھے لکھے نوجوان جن پر مذہب کا اثر کم ہوتا ہے اور اُنہوں نے مغرب کے نظام کا مطالعہ بھی کیا ہوتا ہے وہ چاہے نماز۔ روزہ وغیرہ کا بھی اہتمام کرتے ہوں لیکن وہ دنیاوی مسائل کے حل کے لئے اپنے علم اور محنت پر بھی انحصار کرتے ہیں۔ ان میں سے کافی لوگ تجربہ سے اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ اُنہیں دعاؤں پر کم انحصار کرنا چاہئے اور عمل پر زیادہ۔

اس کے ساتھ چونکہ یہ نوجوان ایسے والدین کی اولاد ہیں جن میں سے اکثر قسمت کے عقیدہ پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ باتیں بچوں کے تحت الشعور میں چلی جاتی ہیں اور اگر ان کو سوچ سمجھ کر باہر نہ نکالا جائے انسان پوری طرح اس عقیدہ سے جان نہیں چھڑا سکتا۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ کچھ ایسے لوگوں سے قانونِ مکافاتِ عمل کے متعلق مرحلہ وار گفتگو کرنے سے اُن کو بات، دلائل کی روشنی میں، لگتا ہے کہ سمجھ آ گئی ہے لیکن چند ہی روز کے بعد وہ پھر وہی بات کریں گے جس پر وہ پہلے سے قائم ہیں۔ مثلاً کسی کام کے متعلق وہ کہیں گے کہ یہ ہو جائے گا اگر اللہ کو منظور ہوا۔ یعنی خود ذمہ داری نہیں لینی اور اللہ پر ڈال دینی ہے۔

انسانی سوچ ارتقائی طور پر آگے بڑھ رہی ہے لیکن چونکہ اس کے سامنے قرآن کی روشنی نہیں ہے اس لئے اس کی رفتار بہت Slow ہے۔ انسانی سوچ کے اوپر منزل کا یقین بہت گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ اگر انسان اسی زندگی کے مفاد کو سامنے رکھ کر

کام کرتا ہے تو وہ ہمیشہ اپنے سامنے وہ مفاد سامنے رکھتا ہے جو کہ اس کو فوراً یا جلدی مل جائیں گے۔ ایسے ذہن کے لوگ کبھی بھی حیاتِ آخرت کا نہیں سوچتے۔ مذہبی لوگ جو ایسی باتیں کرتے ہیں وہ بھی صرف باتوں کی حد تک ایسا کہتے ہیں لیکن ان کا عمل بھی اُنہیں لوگوں کی طرح ہوتا ہے جو کہ کہتے ہیں کہ زندگی موت کے ساتھ ختم ہوجاتی ہے۔ یہ سب انسانوں کے اعمال سے ظاہر ہوجاتا ہے۔

سیکولرزم میں مذہب اور عقائد کو سیاست سے الگ رکھا جاتا ہے۔ ابھی دُنیا میں تھیا کریسی ختم ہوگئی ہے۔ جو ملک اپنے آپ کو مذہبی کہتے ہیں وہاں پر بھی سیکولرزم ہی رائج ہے مثلاً ایران، اسرائیل، پاکستان وغیرہ۔ مذہب ایک ذاتی معاملہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس کا اثر ورسوخ پھر بھی قائم رہتا ہے کیونکہ حکمران عوام پر ذہنی طور پر کنٹرول کرنے کے لئے مذہبی پیشوائیت کی مدد ضرور لیتے ہیں۔ اس لئے تقریباً ہر ملک میں کچھ نہ کچھ مذہب کا اثر باقی ہے۔

یہاں پر ایک بات کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ انسانی ذہن خالی نہیں رکھا جاسکتا ہے۔ اس میں کسی نہ کسی قسم کا عقیدہ یا عقیدے رہتے ہیں۔ انسان اپنی زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد متعین کرتا ہے چاہے وہ مقصد اپنی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے تک ہی محدود کیوں نہ ہو۔ موت کے خوف کو کم کرنے کے لئے وہ مذہب کا سہارا لیتا ہے اور اس سے مذہبی پیشوائیت کا کاروبار چلتا ہے۔ ظاہر ہے کہ غلط عقائد اپنا اثر انسانی ذات پر چھوڑتے ہیں۔

قرآن کا مسئلہ انسان کو اس کی اپنی اہمیت سے روشناس کروانا ہے۔ انسان اپنی خواہشات کے پیچھے چلتا ہے۔ ان خواہشات میں بنیادی خواہش اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنا ہے اور جب یہ پوری ہوجائیں تو پھر وہ اور خواہشات کے پیچھے ہولیتا ہے۔ لیکن قرآنی رہنمائی کے بغیر وہ کبھی بھی اُس اعلیٰ مقصد کے متعلق نہیں سوچ سکتا جو کہ انسانی ذات کی موجودگی اور اس کی نشوونما کے متعلق ہے۔ اس لئے قرآن نے اپنے متعلق کہا ہے کہ یہ کتاب انسان کی اپنی ذات کے متعلق ہے اور اس میں انسان کا اپنا ذکر ہے (21:10)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نوجوان نسل جو کہ سیکولرزم سے متاثر ہے اور دین سے دور ہوتی جارہی ہے اس کو دو باتوں سے کیسے روشناس کروایا جائے؟

پہلی بات یہ کہ انسانی ہاتھوں کے بنائے ہوئے نظام میں کیا خرابیاں ہیں اور جب کہ وہ اس نظام کے نیچے زندگی گزار رہے ہیں اُن کو اس کے پیدا کردہ مسائل کے متعلق علم ہونا چاہئے۔ اگر وہ اس پر آمادہ ہوتے ہیں تو پھر دوسری بات کی طرف اُن کی توجہ مبذول کروائی جائے یعنی قرآنی نظامِ حیات۔ یہ ایک مشکل کام ہے کیونکہ انسانی نظام کے سارمفاد سے نظر ہٹانا آسان کام نہیں ہے۔ اگر انسان ان مفادات سے فائدہ بھی اُٹھا رہا ہے تو وہ کیوں ایک ایسے نظام کی طرف آئے جس کے خدوخال کہیں بھی نظر نہیں آتے اور جس کے لئے اپنی ذات کی تعلیم وتربیت کی بھی ضرورت ہے۔ پھر چونکہ ابھی ایمان نہیں آیا، اس لئے انسان جب ''فرعون'' کے نظام کی طرف دیکھتا ہے تو وہ مضبوطی سے قائم نظر آتا ہے جبکہ دین

کے نظام کی کہیں جھلک بھی نظر نہیں آتی۔ اس سے زیادہ تر انسان جس میں نوجوان طبقہ بھی شامل ہے قرآن کے نظام میں اس حد تک دلچسپی نہیں رکھتے جس میں نظام قائم کرنے کے لئے ضرورت ہوتی ہے۔ اگرچہ لوگ قرآن کو پڑھتے ضرور ہیں اور اُن کو سنتے بھی ہیں جو نظام اور اس کی اقدار کی باتیں کرتے ہیں لیکن یہ سب زبانی جمع خرچ تک ہی محدود رہتا ہے۔ بات آگے نہیں بڑھتی۔

سیکولرزم سے وہی انسان دین کے نظام کی طرف آئیں گے جو کہ اس نظام کے Benificiary ہونے کے باوجود انسانیت کے مفاد کو سامنے رکھ کر قرآن کے حل کی طرف آئیں گے۔ لامحالہ اس کے لئے اُنہیں محنت کرنی ہوگی کیونکہ ہر نظام اپنے اندر تفصیل رکھتا ہے۔ اور انسانی ذہن کی تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے جو والدین وغیرہ چاہتے ہیں کہ نوجوان طبقہ قرآنی نظام میں دلچسپی لے اُنہیں پہلے خود اس نظام کے متعلق بنیادی حقائق کا علم ہو۔ پھر وہ اس نظام کی تفصیل دوسروں کو مرحلہ وار بتا سکیں۔ پھر جو لوگ اس میں دلچسپی ظاہر کریں اُن کو علامہ پرویز کی کتب اور لیکچرز کے متعلق روشناس کروائیں۔ اس مطالعہ میں انسانی نظام کی کمزوریوں کا علم ہونا ضروری ہے تاکہ قرآن جو حل پیش کرتا ہے اس کا تقابل کیا جا سکے۔

یہاں پر انسانی نفسیات کے حوالے سے چند اہم نکات کا ذکر کرنا ضروری ہے:

1۔ انسانی عقل بغیر وحی کی راہنمائی کے صرف مفادِ خویش ہی کا سوچتی ہے۔ وہ اپنے غم کو کم کرنا چاہتی اور اپنی خواہشوں کو بڑھانا چاہتی ہے۔

2۔ انسان کسی راستہ کو اُس وقت لیتا ہے جب اُس کے اندر خواہش اور ضرورت دونوں ہوں۔ وہ اُس راستے پر چلنے کو اپنے فائدہ میں سوچے تو پھر وہ اُس راستہ پر چلتا ہے۔ زیادہ انسان پیش پا افتادہ مفاد کو سامنے رکھ کر چلتے ہیں۔

3۔ چونکہ انسانی طبعی زندگی موت کے ساتھ ختم ہوجاتی ہے اور اگر انسان کو انسانی ''ذات'' کا علم نہ ہو یا وہ اس کا علم حاصل ہی نہیں کرنا چاہتا تو ایسے لوگ اس طرح زندگی گزارتے ہیں جیسے کہ اُن کی زندگی نے موت کے ساتھ ختم ہوجانا ہے۔ اس لئے ایسے لوگوں کے لئے قرآن کے ایمان کو قبول کرنا ناممکن ہوتا ہے جس میں حیاتِ آخرت پر ایمان لاینفک ہوتا ہے۔ وہ اس پر غور کرنے کو بھی تیار نہیں ہوتے۔

4۔ انسان چاہتا ہے کہ وہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے کوشاں رہے اور اگر اس کوشش میں کسی اور انسان کا نقصان بھی ہوجائے تو اکثر لوگ اس کا احساس بھی نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ یہ سب جائز ہے اگر وہ پکڑے نا جائیں یا پھر انسانی نظام اس کی اجازت بھی دے۔ مثلاً کاروبار میں زیادہ سے زیادہ منافع لینا اگر ممکن ہے تو وہ یہ سب کرتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں چونکہ سرمایہ پر منافع ملتا ہے اس لئے جو کسی طرح امیر ہوجاتے ہیں وہ اس نظام کے غلط اثرات کو جانتے ہوئے بھی یہ سب کام کرجاتے ہیں اور امیر سے امیر تر ہوتے جاتے ہیں۔

5۔ اکثر انسان قانونِ مکافاتِ عمل پر یقین نہیں رکھتے یعنی ''انسانی ذات'' کے حوالے سے انسانی نظام کے اندر اُن کو Cause & Effect کا علم ہوتا ہے لیکن یہ سب انسانی قوانین کے حوالے سے ہی ہوتا ہے۔ قرآن کے قانونِ مکافاتِ عمل کا اگر علم بھی ہو تو اکثر اس پر اس طرح ایمان نہیں لاتے جس طرح قرآن نے کہا ہے۔

6۔ انسان کے اندر اختیار اور ارادہ ہونے کی وجہ سے کوئی ہدایت نہیں رکھی گئی۔ اس لئے انسان کو باہر سے ہدایت کی ضرورت ہے۔ یہ ہدایت اب قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ اس ہدایت کے بغیر انسان اپنی خواہشات کے پیچھے چلتا ہے اور زندگی گزار دیتا ہے۔ جب انسان بغیر ہدایت کے چلتا ہے اور دُنیا میں کام کرتا ہے تو ایسی دنیا میں وہ اپنے لئے مشکلات پیدا کرتا ہے۔ قرآن کی ہدایت کے بغیر انسان کبھی بھی پوری انسانیت کے لئے ایسا نظام تشکیل نہیں کر سکتا جو کہ سب کی بھلائی کے لئے ہو اور جس میں انسانی ذات (Human Self) کی نشوونما کا بھی انتظام ہو سکے۔

یہ چند اہم نکات انسان کی نفسیات کے حوالے سے یہاں لکھے ہیں۔ انسان ایک پیچیدہ ہستی ہے۔ اس کا دماغ ہر قسم کے خیالات پیدا کرتا ہے اور خواہشات سے بھرا رہتا ہے۔ بغیر قرآنی ہدایت کے انسان فیصلہ اپنی مرضی سے یا حالات اور اضافی اقدار کے تحت کرتا ہے۔ بغیر اپنی ''ذات'' کے احساس کے انسان اس زندگی کی مادی ضروریات کے ارد گرد گھومتا رہتا ہے اور زندگی کے اعلیٰ مقصد کا کم ہی سوچتا ہے۔ جو کبھی سوچتے بھی ہیں اُن کو کوئی قرآن کی تعلیم پیش کرنے والا نہیں ملتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ جن کو سمجھ آ گئی ہے وہ زیادہ سے زیادہ انسانوں کو پیغام پہنچائیں۔

جہاں تک نوجوان نسل کا سیکولرزم سے متاثر ہونے کا تعلق ہے یہ ایک قدرتی فعل ہے کہ انسان اس زندگی کو گزارنے کے لئے بہتر سے بہتر کی تلاش میں رہتا ہے۔ مذہب کی دُنیا سے جب انسان کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا اور وہ اس کی کمزوریوں سے آگاہ ہوتا ہے تو وہ اُس سے بہتر نظام کی تلاش میں سیکولرازم کی طرف آ جاتا ہے۔ اس سے اگلی سٹیج دین کے نظام کی ہے۔ اس لئے اُن کے سامنے قرآن کی ہدایت اور تعلیم پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں طلوعِ اسلام کی کتب اور لیکچرز وغیرہ مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ بہرحال فیصلہ اُنہوں نے خود کرنا ہے۔

تصحیح

قارئینِ طلوعِ اسلام تصحیح فرمالیں کہ گذشتہ ماہ کے ماہنامہ طلوعِ اسلام بابت مارچ 2025ء میں ایک مضمون بعنوان ''قرآن وسنت؟'' محترم انوار خان کے نام کے ساتھ شائع ہوگیا ہے جب کہ وہ مضمون محترم جمال حسین شاہ صاحب ایبٹ آباد کا تحریر کردہ تھا۔ (ادارہ)

ڈاکٹر اعجاز رسول (وائس چیئر مین ادارہ طلوعِ اسلام)

ڈاکٹر خالد سندھو کی وفات پر تعزیت

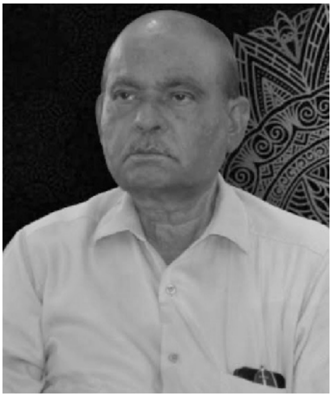

ڈاکٹر خالد سندھو جو کہ نیوزی لینڈ کے شہر ویلنگٹن میں کافی عرصہ سے مقیم تھے اتوار 23 فروری 2025 کو اس جہانِ فانی سے اگلی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب اور اُن کی رفیقِ حیات ڈاکٹر رضیہ سندھو طلوعِ اسلام کے بہت اہم ساتھیوں میں رہے ہیں۔ وہ اگرچہ ملک سے باہر تھے لیکن اُن کا دل طلوعِ سال کے ساتھ رہتا تھا۔ اُنہوں نے خود علامہ پرویز علیہ الرحمہ کی کتب کا مطالعہ کر کے طلوعِ اسلام کے ساتھ وابستگی اختیار کر لی۔ اُن کے گھر میں علامہ پرویز صاحب کی تقریباً تمام کتب موجود تھیں اور وہ اسلام بحیثیتِ دین کے ہر ایک سے وہاں پر بات چیت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر جمعہ کے خطبات بھی دیتے تھے۔ کچھ سالوں سے اُن کی صحت بڑھتی عمر کی وجہ سے خراب رہنے لگ گئی تھی۔ لیکن اُن کے جوش اور ولولہ میں کبھی بھی کمی واقع نہ ہوئی۔ جب بھی اُن سے بات ہوئی وہ ہمیشہ طلوعِ اسلام تحریک اور قرآن کے حوالے سے ہوئی۔

اُنہوں نے طلوعِ اسلام (ٹرسٹ اور ادارہ) کے لئے مالی طور پر بھی مدد کی۔ اُن کی وفات سے طلوعِ اسلام ایک اہم سپورٹر سے اگرچہ محروم ہو گیا ہے لیکن موت تو ایک عارضی مرحلہ ہے اور اگلی زندگی میں اُن سے ملاقات ہو گی۔ اُن کا ایک بیٹا ہے، ڈاکٹر عمران سندھو جو کہ امریکہ میں مقیم ہیں، اُن سے تعزیت کی گئی ہے اور اُن سے کہا ہے کہ وہ طلوعِ اسلام سے رابطہ رکھیں۔ اُن کی اہلیہ ڈاکٹر رضیہ سندھو سے بھی تعزیت کی گئی ہے اور وہ بڑے حوصلے سے اس کو برداشت کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ اپنے بیٹے کے ساتھ رہنے کے لئے نیوزی لینڈ سے امریکہ جا رہی ہیں۔

نوٹ: ڈاکٹر طاہرہ اکرم صاحبہ جو کہ طلوعِ اسلام کے بہت بڑے خیر خواہوں میں سے ہیں وہ ڈاکٹر رضیہ سندھو کی بھتیجی ہیں۔ اُن سے بھی تعزیت کی گئی ہے۔

خورشید انور (چیئرمین ادارہ طلوعِ اسلام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطاب بتقریب بیادِ پرویز علیہ الرحمہ

منعقدہ زیرِ اہتمام بزمہائے طلوعِ اسلام سوات

24 فروری ملک وملت کے اس عظیم محسن مفکرِقرآن علامہ غلام احمد پرویز علیہ رحمہ کا یوم وفات ہے۔ جنہوں نے تحریک پاکستان میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ مگر بد قسمتی سے گروہ مترفین بالخصوص مذہبی پیشوائیت کے ڈر سے اس عظیم محسن کی برسی ہر سال خاموشی سے گذار جاتی ہے اور الیکٹرانک و پرنٹ میڈیا دونوں پر ان کی خدمات کے حوالے سے کوئی تذکرہ تک نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ مفاد پرست طبقہ جانتا ہے کہ اگر علامہ پرویز علیہ الرحمہ کی قرآنی فکر عام لوگوں تک پہنچ گئی، تو پھر موجودہ سرمایہ دارانہ سیکولر نظام اور مفاد پرست حکمرانوں کے جھوٹ پر مبنی دعووں کے لیے کوئی وجہ جواز باقی نہیں رہے گی۔

بزمہائے طلوع اسلام سوات نے مشترکہ طور پر اس عظیم محسن کی یاد میں یہ پروگرام اس غرض سے منعقد کیا ہے کہ عوام الناس کو ان کی خدمات جلیلہ سے آگاہ کیا جائے۔ میں پہلے علامہ پرویز علیہ رحمہ کی خدمات کا مختصراً ذکر کرونگا اور آخر میں اس سوال پر اپنی گذارشات پیش کرونگا کہ ہم علامہ پرویز صاحب کی برسی کیوں مناتے ہیں اور کیوں منانی چاہیے؟

علامہ غلام احمد پرویز متحدہ ہندوستان کے شہر بٹالہ کے ایک مذہبی گھرانے میں 9 جولائی، 1903 کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی دینی تعلیم اپنے دادا مولوی رحیم بخش سے حاصل کی جو ایک ممتاز عالم دین، تصوف کے چشتیہ سلسلہ کے معروف بزرگ اور ایک ماہر حکیم تھے۔ سکول، کالج سے فارغ ہونے کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے لاہور آئے۔ دادا جان کی ہدایت کے مطابق علامہ اقبال علیہ رحمہ سے ملاقات کی، اور پھر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ انہوں نے علامہ پرویز کو قرآن فہمی کے قرآنی طریقہ کار سے روشناس کرایا۔ بی۔اے کرنے کے بعد دہلی میں حکومت ہند کے مرکزی سیکرٹریٹ کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ملازمت اختیار کی۔

علامہ پرویز نے اپنے عصر کے مایہ ناز اسلامی مفکرین، سرسید احمد خان، علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری اور علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کے افکار سے استفادہ کیا اور ان کے تتبع میں رجعت الی القرآن کی آواز بلند کی اور تمام عمر قرآن کریم کے حقائق اور اسے لانے والے رسول اعظم علیہ السلام کی عظمت کردار کو قوم کے سامنے پیش کرتے رہے۔

قرآن کریم کے مطابق سلسلہ نبوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس واعظم پر ختم ہو گیا ہے۔ مگر وقتاً فوقتاً مختلف ممالک میں جھوٹے مدعیان نبوت اٹھتے رہے اور ملت اسلامیہ میں انتشار اور فساد کا موجب بنتے رہے۔ ہندوستان میں بھی مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا۔ 1926 کا ذکر ہے کہ ریاست بہاولپور کی ایک عدالت میں ایک مقدمہ دائر

ہوا جس میں ایک مسلمان خاتون نے یہ دعویٰ کیا کہ اس کے خاوند نے قادیانی مسلک اختیار کرلیا ہے جس کی وجہ سے وہ مرتد ہو گیا ہے۔ اس لیے اس شخص سے مدعیہ کا نکاح فسخ قرار دیا جائے۔ اس مقدمہ نے ملک گیر شہرت حاصل کرلی اور مسلمانوں میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ اس لیے نہیں کہ اس میں فریقین کی حیثیت بڑی ممتاز تھی، وہ تو بالکل غیر معروف سے تھے۔ بلکہ اس لیے کہ ہندوستان میں (غالباً) یہ اپنی نوعیت کا پہلا مقدمہ تھا جس میں فیصلہ طلب سوال یہ تھا کہ ایک شخص قادیانی مسلک اختیار کرنے کے بعد مسلمان رہتا ہے یا نہیں۔ اس اعتبار سے یہ مقدمہ متعلقہ فریقین کا مابہ النزاع معاملہ نہ رہا بلکہ قادیانیوں اور غیر قادیانیوں کے مابین ایک دینی سوال بن گیا۔ یہ مقدمہ قریب نو سال تک زیر سماعت رہا۔ اس مقدمہ میں مدعیہ کی طرف سے بطور گواہ، مولوی غلام محمد صاحب شیخ الجامعہ عباسیہ بہاولپور، مولوی محمد حسین صاحب، سکنہ گوجرانوالہ، مولوی محمد شفیع صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند، مولوی مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری، سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری (شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند) مولوی نجم الدین صاحب پروفیسر اورینٹل کالج لاہور پیش ہوئے۔ ان اہم مذہبی شخصیات کا اس مقدمہ میں بطور گواہ پیش ہونے سے اس مسئلہ کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ فاضل جج نے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ اس مسئلہ کا سارا دارومدار اس بات پر تھا کہ نبوت کی حقیقت کیا ہے اور نبی کسے کہتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ:

موجودہ زمانے میں بہت سے مسلمان نبی کی حقیقت سے بھی آشنا نہیں۔ اس لیے بھی ان کے دلوں میں یہ مسئلہ گھر نہیں کرسکتا کہ مرزا صاحب کو نبی ماننے میں کیا قباحت ہوتی ہے کہ جس پر اس قدر چیخ پکار کی جارہی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کی تھوڑی سی حقیقت بیان کر دی جائے۔

آگے چل کر فاضل جج نے لکھا ہے کہ ''مدعیہ اور مختلف علمائے کرام کی طرف سے پیش کردہ نبی کی تعریفیں میرا اطمینان نہ کرسکیں۔'' وہ لکھتے ہیں کہ ''یہ تعریفیں چونکہ اس حقیقت کے اظہار کے لیے کافی نہ تھیں، اس لیے میں اس جستجو میں رہا کہ نبی یا رسول کی کوئی ایسی تعریف مل جائے جو تصریحات قرآن کی رو سے تمام لوازم نبوت پر حاوی ہو۔ اس سلسلہ میں مجھے مولانا محمود علی صاحب، پروفیسر رندھیر کالج کی کتاب دین و آئین دیکھنے کا موقعہ ملا۔ انہوں نے معترضین کے خیالات کو مدنظر رکھتے ہوئے نبوت کی حقیقت یہ بیان کی ہے، کہ جس شخص کے دل میں کوئی نیک تجویز بغیر ظاہری وسائل اور غور کے پیدا ہو، ایسا شخص پیغمبر کہلاتا ہے۔ اور اس کے خیالات کو وحی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ تعریف بھی مجھے دلچسپ معلوم نہ ہوئی۔ آخر کار ایک رسالہ میں ایک مضمون بعنوان میکانیکی اسلام از جناب چودھری غلام احمد میری نظر سے گزرا۔ اس میں انہوں نے مذہب اسلام کے متعلق آج کل کے روشن ضمیر طبقہ کے خیالات کی ترجمانی کی ہے۔ اور پھر خود ہی اس کے حقائق بیان کیے ہیں۔ اس سلسلہ میں نبوت کی جو حقیقت انہوں نے بیان کی ہے، میری رائے میں اس سے بہتر اور کوئی بیان نہیں کی جاسکتی۔ اور میرے خیال میں فریقین میں سے کسی کو اس پر انکار بھی نہیں ہوسکتا۔ اور آخر الامر محمد اکبر صاحب، ڈسٹرکٹ جج بہاولنگر نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیتے ہوئے، 7 فروری 1935 کو اس کا فیصلہ سنا دیا۔ یہ فیصلہ اپنی شہرت اور اہمیت کے پیش نظر اس زمانے میں بھی الگ چھپ گیا تھا اور اس کے بعد بھی چھپتا رہا۔ علامہ پرویز نے اس موضوع پر ایک الگ تصنیف ''ختم نبوت اور تحریک احمدیت'' کے نام

سے بھی تحریر کی ہے جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ اس تحریک کے اصل مقاصد کیا تھے اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد، دعوی نبوت کرنے والے کی حقیقت کیا ہے۔''

اسی طرح جب مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کی تفسیر ''ترجمان القرآن'' کی پہلی جلد شائع ہوئی تو انہوں نے سورہ فاتحہ کی ابتدا میں لکھا تھا کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں ہیں۔ اگر ان مذاہب کے پیروکار اپنے اپنے مذاہب کی سچائیوں کو اپنائیں، تو قرآن کی منشا پوری ہوجاتی ہے۔ علامہ پرویز کی قرآنی بصیرت کے مطابق یہ نظریہ اسلام کو جڑ اور بنیاد سے اکھاڑ نے کے مترادف تھا۔ انہوں نے سوچا کہ یہ نظریہ برہمو سماج کی تعلیم تو ہوسکتی ہے لیکن قرآن کی نہیں۔ اس لئے انہوں نے اس نظریے کی تردید میں ایک تفصیلی مضمون لکھا۔ جو ماہنامہ معارف اعظم گڑھ میں 1933 میں شائع ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو اس زمانے میں علم کا سمندر اور زبان کا بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔ اتنی مقبول شخصیت پر تنقید اور وہ بھی ایک غیر مولوی کا قلم سے صرف علامہ پرویز جیسے مردِ مومن کا کام ہوسکتا تھا۔

جب علامہ اقبال علیہ رحمہ نے 1930 میں الہ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں اپنے صدارتی خطبہ میں مسلمانانِ ہند سے مخاطب ہوکر فرمایا، کہ اسلام مذہب نہیں دین ہے اور ایک علیحدہ آزاد مملکت کا متقاضی۔ جہاں پر مسلمان قرآنی اصول و اقدار کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ اس مملکت کے قیام سے اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہوکر جو عربی ملوکیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے، جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف اس کی صحیح معنوں میں تجدید ہوسکے گی۔ بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہوجائے گی۔

اس خطاب نے علامہ پرویز علیہ رحمہ کو اس درجہ متاثر کیا کہ باوجود سرکاری ملازمت کے وہ اس تحریک میں ہراول دستے کے مجاہد کے طور پر خدمات انجام دینے لگے۔

ہندوستان کے علماء کی اکثریت شروع دن ہی سے تحریک پاکستان کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ مگر ان کے توڑ کیلئے علامہ اقبال علیہ رحمہ مصروف جہاد تھے۔ لیکن جب ان کی آخری جان لیوا بیماری نے شدت اختیار کی۔ تو انہوں نے اس محاذ کو سنبھالنے کے لئے علامہ پرویز کا نام تجویز کیا۔ اسی طرح اسکے ایماء پر قائداعظم نے اپنے قیام شملہ کے دوران علامہ پرویز کو بلایا اور بتایا کہ سیاسی محاذ پر تو وہ خود یہ جنگ لڑ رہے ہیں مگر یہ جو قال اللہ اور قال رسول کے نام پر تحریک پاکستان کی مخالفت ہورہی ہے یہ محاذ آپ سنبھال لیں۔ علامہ پرویز نے حامی بھر لی، اور اسی مقصد کے حصول کے لئے قائداعظم کی ہدایت پر ماہنامہ طلوع اسلام کا اجراء ثانی مئی 1938 میں عمل میں لایا گیا۔ علامہ پرویز نے اپنے زور قلم سے اس حقیقت کی بھرپور وکالت کی کہ ایک آزاد مسلم ریاست کا قیام محض ایک سیاسی نعرہ نہیں بلکہ قرآن کریم کے رو سے خالصتاً ایک دینی تقاضا ہے۔ وہ اپنی شبانہ روز محنت سے اس مجوزہ مملکت اور اس کے قیام کی اہمیت کو اللہ اور اس کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں قوم کے سامنے پیش کرتے رہے۔ وہ تحریک پاکستان کے دوران کم وبیش دس سال تک قائداعظم محمد علی جناح کے دینی مشیر رہے۔

قائداعظم کی ہمنوائی میں علامہ پرویز ایک آزاد مملکت کے قیام کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہے، حتی کہ حق پر مبنی

ان کوششوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے شرف قبولیت عطاء ہوئی اور 14 اگست 1947 کو دنیا کے نقشے پر سب سے بڑی آزاد مسلم ریاست "پاکستان" وجود میں آ گیا۔لیکن چونکہ تحریک پاکستان مخالف علماء، علامہ پرویز کو اپنی شکست کا ذمہ دار گردانتے تھے اس لیے انہوں نے شکست کا انتقام لینے کیلئے علامہ پرویز کے خلاف طرح طرح کے بے بنیاد الزامات لگانے شروع کر دیئے۔علامہ پرویز تمام عمر، ان الزامات اور بہتان طرازیوں سے بے نیاز ہوکر، اس ملک میں خلافت علی منہاج نبوت کے قیام کے لیے کوشاں رہے، جسے قائم کرنے کے لیے یہ خطہ زمین حاصل کیا گیا تھا۔

علامہ پرویز جہاں ایک طرف حکمرانوں اور قوم کی توجہ بانیان پاکستان کے تصور کے مطابق حقیقی اسلامی نظام کے قیام کی طرف دلاتے رہے تو دوسری طرف بحر قرآن میں غوطہ زن ہوکر وہ موتی و جواہرا کھٹے کئے کہ اگر انسانیت اس کی مالا پرو کر گلے میں ڈال دیں تو منزل کی طرف جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی بلکہ منزل خود آ کر ان کی قدموں کا بوسہ لے گی۔انہوں نے زندگی کے ہر گوشے اور مملکت کے ہر شعبے کے متعلق قرآنی ہدایات پر مشتمل لٹریچر کا ایک وافر ذخیرہ، اور آڈیو، ویڈیو دروس القرآن چھوڑے ہیں۔

ان کے کام میں آڈیو، ویڈیو دروس القرآن کے علاوہ لغات القرآن، مفہوم القرآن تبویب القرآن، تفسیر قرآن، مطالب الفرقان (سورہ فاتحہ تا سورہ الحجر) سیرت طیبہ (معراج انسانیت)، دور فاروقی کی تاریخ (شاہکار رسالت) علامہ اقبال کے حقیقی افکار پر مشتمل تصنیف (اقبال اور قرآن) ختم نبوت کے موضوع پر معرکہ آرا کتاب (ختم نبوت اور تحریک احمدیت) مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں، انسان نے کیا سوچا؟ من ویزداں (اللہ کا صحیح تصور)، ابلیس و آدم، جوئے نور، برق طور (داستان حضرت موسیٰ)، شعلۂ مستور (حضرت عیسیٰ کی داستان)، اسلام کیا ہے؟ کتاب التقدیر، جہان فردا (مرنے کے بعد کیا ہوگا؟)، نظام ربوبیت (قرآن کا معاشی نظام)، تصوف کی حقیقت، قرآنی قوانین، سلیم کے نام خطوط، طاہرہ کے نام خطوط، حسن کردار کا نقش تابندہ (قائداعظم) مجلس اقبال۔اول (شرح مثنوی اسرار خودی در موز بے خودی، مجلس اقبال۔دوم (شرح مثنوی پس چہ باید کرد...) قائداعظم کے تصور کا پاکستان، بہار نو ،فردوس گم گشتہ (مجموعہ مقالات و خطبات)، مقام حدیث، قرآنی فیصلے قتل مرتد غلام اور لونڈیاں اور یتیم پوتے کی وراثت، اسلامی معاشرت (روزمرہ کے متعلق قرآنی احکام و ہدایات)، اسباب زوال امت، جہاد (جہاد کے متعلق قرآن کریم کے احکامات)، خدا اور سرمایہ دار، سلسبیل، (مجموعہ مقالات و خطبات)، مزاج شناس رسول تحریک پاکستان کے گم گشتہ حقائق، اور Islam a Challenge to Religion شامل ہیں۔الغرض علامہ پرویز نے اپنی پوری زندگی اور اپنے سارے وسائل کو قرآنی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے وقف کیا۔کبھی دولت، شہرت، اقتدار یا کسی اور مفاد کی خواہش نہیں کی۔علامہ پرویز کی فکر قرآنی کا بنیادی نکتہ علامہ اقبال کا یہ پیغام تھا کہ

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

یعنی اگر آپ صحیح معنوں میں مسلمان کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو ایسا صرف اور صرف قرآن خالص کی تعلیمات کو اپنانے سے ہی ممکن ہے اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں۔

چونکہ علامہ پرویز نے قرآن کریم پر تحقیق اور پھر اس کا ابلاغ اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہوا تھا اس لئے انہوں نے اس مقصد کے حصول کیلئے ایک ادارہ، طلوع اسلام کے نام سے قائم کیا۔

قرآنی نظام کے قیام کے لئے انہوں نے تحریک طلوع اسلام کی بنیاد رکھی ، اور ملک کے طول وعرض اور بیرون ملک مقامی سطح پر بزمہائے طلوع اسلام کو بھی متعارف کروایا۔

اس کے علاوہ علامہ پرویز شروع دن ہی سے ارباب اختیار کی توجہ نوجوان نسل کے معیاری تعلیم وتربیت کے طرف دلاتے رہے، مگر سننے والا کون تھا؟ جب ان کی یہ پکار صدا بصحرا ثابت ہوئی تو انہوں نے ایک کالج کے قیام کا فیصلہ کیا اور واضح کیا کہ اس میں بتدریج اوپر یونیورسٹی لیول تک اور نیچے نرسری لیول تک توسیع کی جائے گی۔ ہاسٹل بھی ساتھ ہوگا اور قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی بھی بنائی جائے گی۔ تاکہ طلباء کی صحیح تعلیم اور اخلاقی تربیت، قرآنی تعلیمات اور عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق کی جاسکے۔ احباب کے تعاون سے زمین خریدی گئی اور تعمیر کے لئے قانونی اجازت حاصل کرنے کا آغاز کیا گیا۔ کہ اس دوران اس وقت کی حکومت نے پرائیویٹ اداروں کو سرکاری تحویل میں لینے کا فیصلہ کیا اور نئے پرائیویٹ اداروں کے قیام پر پابندی لگادی۔ اس طرح ان کی یہ آخری خواہش اور دلی آرزو پوری نہ ہوسکی۔ تاہم انہوں نے ایک طرف تحریر وتقریر کے ذریعے ابلاغ قرآن کا سلسلہ جاری رکھا اور دوسری طرف ارباب اختیار کو ان کی ذمہ داریوں کی یاد دہانی کراتے رہے اور مزید غفلت کی صورت میں تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتے رہے۔

جب مشرقی پاکستان میں حالات انتہائی خراب ہونے لگے، تو وہ جائزہ لینے کی غرض سے خود مشرقی پاکستان کے دورے پر گئے۔ وہاں انہوں نے حالات کا بغور جائزہ لیا، اور اسباب وعوامل پر مبنی تفصیلی رپورٹ مرتب کرکے ارباب اختیار کو پیش کی، اور یہ بھی بتایا کہ اگر ان خرابیوں اور محرومیوں کا بروقت ازالہ نہ کیا گیا تو نتیجہ علیحدگی کی صورت میں نکل سکتا ہے۔ مگر طاقت اور دولت کے نشے میں بدمست ارباب اختیار نے اسے ایک بے بنیاد خدشہ سمجھتے ہوئے نظر انداز کیا۔ اور نتیجہ یہ کہ قرآنی نظریہ کی بنیاد پر حاصل کردہ ملک دو حصوں میں بٹ گیا۔ جس پر بھارت کے اس وقت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ دراصل حق پر مبنی نظریہ کی جیت اور باطل پر مبنی نظریہ کی شکست ہے۔ یہ بیان گویا اس وقت کے حکمرانوں کے منہ پر ایک طمانچہ تھا، مگر کاش کہ وہ احساس کی نعمت سے محروم نہ ہوتے۔

وائے ناکامی! متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

علامہ پرویز علیہ رحمہ نے تحریر وتقریر اور ابلاغ کا یہ سلسلہ تادم مرگ جاری رکھا۔ معمول کے مطابق 15 اکتوبر 1984 کو اپنے مکان 25 بی گلبرگ میں آخری مرتبہ درس دیا اور اس کے بعد مسلسل بستر علالت پر رہے۔ 24 فروری 1985ء، کو ملک وقوم کا یہ عظیم محسن اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔ اللہ تعالی انہیں اپنے سحاب کرم سے نوازیں۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿٢٦﴾ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿٢٧﴾ [55:26-27]

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اب آخر میں اس سوال پر آتے ہیں کہ ہم علامہ پرویز صاحب کی برسی کیوں مناتے ہیں یا ان کی برسی کو کیوں منانا چاہیے تو اس سلسلے میں سب سے پہلی وضاحت یہ ہے کہ ہم ان کی قصیدہ خوانی کیلیئے ان کی برسی نہیں مناتے۔ نہ ہی وہ ہمارے کوئی مذہبی پیشوا یا کسی نئے فرقے کے موجد یا بانی ہے۔ پرویز صاحب کے مطابق، وہ جو کچھ پیش کرتے ہیں قرآن سے پیش کرتے ہیں۔ اور ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ خود قرآن کو سمجھے اور یہ کہ ان کی کوئی بات حرف آخر نہیں۔ کیونکہ دین کے معاملے میں جب بھی کسی انسان کی بات کو حرف آخر سمجھا گیا تو اس وقت ایک نئے فرقے کی بنیاد رکھ دی گئی اور فرقہ پرستی قرآن کے رو سے شرک ہے۔ لہٰذا ہم نہ پرویز صاحب کے مرید ہیں اور نہ ان کے لئے نئے مریدوں کی تلاش میں ہیں۔ ہم ان کے قائم کردہ پلیٹ فارم سے مسلمانوں میں فرقہ پرستی کے خاتمے اور قرآن خالص پر مبنی نظام کے لئے کوشاں ہیں۔ دوسری وضاحت یہ ہے کہ ہم ان کی برسی اسلئے مناتے ہیں اور منانی چاہیے کہ انہوں نے قرآنی حقائق پر پڑے پردوں کو ہٹا کر قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کی ہے۔ اور دور جدید کے مسائل کا حل قرآن سے ہی پیش کیا ہے اور آئین قرآنی کے ماتحت ایک اسلامی ریاست کو دین کا تقاضہ اور اصل مقصد قرار دیا ہے۔ لہٰذا روایتی مذہب سے ہٹ کر ان انقلابی قرآنی تصورات کی تعلیم کی بات جب بھی کی جائے گی سب سے پہلا سوال یہی ہوگا کہ یہ حقائق کس نے بیان کئے ہیں اور وہ شخصیت کون ہے جنہوں نے روایتی تصورات سے ہٹ کر قرآن کی تعلیمات پیش کی ہیں؟ اسی وجہ سے ان کا تعارف کرانا ضروری ہوجاتا ہے۔ اور یہاں اس بات کی وضاحت انتہائی ضروری ہے کہ ان کی برسی منانے کی وجہ نہ ان کی ذات سے کوئی مذہبی عقیدت ہے اور نہ ہی کوئی شخصیت پرستی۔ ہم قرآن کی تشریح اور دینی معاملات میں کسی بھی فرد واحد بشمول پرویز صاحب کی بات کو حرف آخر سمجھنے کے ببانگ دہل مخالف ہیں۔ پرویز صاحب کا مقصد صرف رجوع الی القرآن تھا اور ان کی برسی منانے کا واحد مقصد یہ ہے کہ لوگ انسانوں کے تراشیدہ غیر قرآنی عقائد کو چھوڑ کر قرآن خالص کی طرف آئیں۔ ہمارا یہ مقصد بھی نہیں کہ لوگوں سے پرویز صاحب کی ہر بات من وعن منوائیں، بلکہ ہمارا نظریہ صرف یہ ہے کہ دین کا مقصد اللہ کی زمین پر اللہ کے احکام کا عملی نفاذ ہے۔ اور تمام تشریح طلب اور اختلافی معاملات کا فیصلہ کرنے کا اختیار کسی فرد واحد کو بالکل نہیں بلکہ قرآن خالص کے احکام کے ماتحت تشکیل پانے والی حکومت اور مسلمانوں کی شوری کو حاصل ہے۔ ہم پرویز صاحب کو صرف قرآن کا ایک عالم اور داعی سمجھتے ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں، اور ان کی برسی صرف اس لیے مناتے ہیں کہ لوگوں کو، قرآن کو قرآن سے سمجھنے کی طرف راغب کریں تاکہ تمام دنیا کے مسلمان قرآن پر اکٹھے ہوکر فرقوں اور مسلکوں کی قید سے آزاد ہوجائیں اور ایک دفعہ پھر اسلام کے عروج کا دور واپس لوٹ آئے۔ بقول علامہ اقبال علیہ الرحمہ

ایک ہوں مسلم حرم کے پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاک کاشغر

آپ کی تشریف آوری اور توجہ کا بہت بہت شکریہ والسلام

اقبال ادریس ایڈووکیٹ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریب بیادِ پرویز علیہ الرحمہ منعقدہ زیر اہتمام بزمہائے طلوعِ اسلام سوات میں یہ تقریر کی گئی۔ (مدیر)

عزیزانِ محترم سامعین کرام! السلام علیکم

آج ہم سب علامہ غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ کی 40 ویں برسی کے موقع پر یہاں جمع ہیں۔ اور ان کی علمی خدمات اور قرآن کریم سے ان کے والہانہ محبت کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کی اپنی اپنی سعی کر رہے ہیں جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ علامہ صاحب کی تاریخ پیدائش جولائی 1903ء ہے۔ آپ ہندوستان کے ایک قصبہ بٹالہ میں پیدا ہوئے تھے اور 24 فروری 1985ء کو پاکستان کے شہر لاہور میں وفات پائی۔

پرویز علیہ الرحمۃ نے اپنی ساری زندگی قرآن کو سمجھنے اور سمجھانے میں صرف کی ہے اور اپنے مخصوص انداز میں قرآنی تعلیمات دنیا کے سامنے پیش کی ہیں۔ کوئی لگی لپٹی بغیر جو صحیح سمجھا اُسے من و عن پیش کیا ہے۔ ان کی علمی خدمات کا ذکر ہم جیسے کم علم تو قطعاً نہیں کر سکتے اور میں تو یہاں تک کہنے کی جرأت کروں گا کہ اُن کے ہم عصر بھی ان کی تبحرِ علمی کا اندازہ لگانے میں ناکام رہے ہیں۔ آج اس جدید دور اور علمی لحاظ سے بلند پایہ وقت میں بھی پرویز علیہ الرحمۃ کے پایہ کا مفسر اور مبلغ پیدا نہیں ہوا ہے۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ایک طرف اگر ان کی تحریریں ادبی لحاظ سے شاہ کار ہیں۔ تو دوسری طرف قرآنِ کریم کی تعلیمات انتہائی خوبصورت اور دلنشین انداز میں پیش کی ہیں کہ سیدھی دل میں اتر جاتی ہیں۔ ایک طرف بڑے سے بڑا فلسفی/ دانشور جب پرویز صاحب کی تحریروں سے لطف اُٹھاتا ہے، تو دوسری طرف ایک کم تعلیم یافتہ شخص بھی جب اُن کا پیغام سمجھ لیتا ہے تو پھر اُسی کا ہو جاتا ہے اور اپنے سادہ انداز میں قرآنِ کریم کے فکر کو آگے بڑھاتا ہے۔

میرے پرانے احباب جانتے ہوں گے کہ ہمارا ایک قرآنی فکر کا دوست جو شاید چار/ پانچ جماعت پڑھ چکا تھا۔ مگر قرآن سے محبت کا عالم یہ تھا کہ پرویز صاحب کی فکر سمجھ چکا تھا اور ہر ہفتہ بلاناغہ درسِ قرآن میں شرکت کیا کرتا تھا۔ میرا اشارہ محترم خیر گل اُستاد کی طرف ہے۔ وہ دمغار ڈھیرئی سے تعلق رکھتا تھا۔ (اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے) دنیاوی تعلیم کی کمی کے باوجود قرآن کو سمجھ کر، اس کا پیغام دوسروں تک پہنچاتا تھا۔ ایسے بہت سے ساتھی ہیں ہمارے جو کم تعلیم ہونے کے باوجود قرآن

کا پیغام عام کررہے ہیں۔

عزیزانِ محترم! ضروری نہیں کہ ایک شخص اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتو وہ قرآن کو سمجھ لے گا۔ آپ گواہ ہیں کہ کتنے So Called اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ قرآن کی سچی تعلیم سے بدکتے ہیں۔ اور ایسی عالی شان تعلیم ان کے سروں کے اوپر سے گذر جاتی ہے۔ دوسری طرف کم تعلیم یافتہ افراد قرآن کے پیغام کو آسانی سے سمجھ لیتے ہیں سچ کہا ہے شاعر نے ۔

عشق کی چوٹ تو پڑتی ہے دلوں پر یکسر
ظرف کے فرق سے آواز بدل جاتی ہے

واقعی اللہ کا فرمان ہے:

''ہم نے اس قرآن کو سمجھنے کے لئے آسان بنادیا ہے پس کوئی ہے جو سوچے سمجھے۔''

پرویز صاحب کا طرزِ تحریر اور طرزِ بیاں اردو ادب میں اپنا ایک اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔ بقول قومی ترانے کے خالق حفیظ جالندھری ''ہم شاعر اور ادیب لوگ جب لکھنے بیٹھ جاتے ہیں تو الفاظ کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ جبکہ پرویز صاحب کے سامنے الفاظ دست بستہ کھڑے ہوتے ہیں۔ گویا کہہ رہے ہوں ہم میں سے کسی لفظ کا انتخاب کیجئے۔''

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ پر ان کی شاہکار تخلیق ''معراج انسانیت'' اس کا بین ثبوت ہے۔ اس کتاب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کا احوال جن الفاظ میں کیا گیا ہے۔ سیرت کی تمام کتابیں چھان لیجئے ایسا انداز بیاں آپ کو نہیں ملے گا۔ ادب کا طالبعلم اسے جھوم جھوم کر پڑھتا ہے اور ممکن نہیں ہے کہ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں نہ ہوں۔ اپنی تحریروں میں جس طرح وہ اشعار کا انتخاب کرتا ہے آپ ادب کی ساری کتابیں کھنگال لیجئے آپ ایسے برمحل اشعار، تشبیہات واستعارات نہیں دیکھ پائیں گے۔

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

اپنی کتاب ''اسلام کیا ہے؟'' میں جب وہ تھامس مور کی نظم، جس کا منظوم ترجمہ نادر کاکوری نے بہت ہی دلنشین انداز میں کیا ہے۔ موقع ومحل کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ نظم کے چند شعر آپ بھی سماعت فرمائیں۔

اکثر شبِ تنہائی میں
کچھ دیر پہلے نیند سے
گزری ہوئی دلچسپیاں
بیتے ہوئے دن عیش کے

بنتے ہیں شمعِ زندگی
اور ڈالتے ہیں روشنی
میرے دلِ صد چاک پر
وہ بچپن اور وہ سادگی
وہ رونا وہ ہنسنا کبھی
پھر وہ جوانی کے مزے
وہ دل لگی وہ قہقہے
وہ عشق وہ عہدِ وفا
وہ وعدہ اور وہ شکریہ
وہ لذتِ بزمِ طرب
آتے ہیں یاد ایک ایک سب

عزیزانِ من! بدقسمتی سے ہمارے ہاں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے جس نے اپنی زندگی کا مشن یہ قرار دے رکھا ہے کہ جو کچھ ان کے ذہنوں تک رسائی حاصل نہ کر سکے اس کے خلاف بے بنیاد الزامات تراشے جائیں اور پھر انہیں اس شدومد سے پھیلائیں کہ لوگ اس جھوٹ کو سچ سمجھ لیں اور پھر آپ کی بات سننا گوارا نہ کریں۔

جہالت کو یہ کمال حاصل ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو مقدس بنا دیتی ہے جو مقدس جھوٹ بولنے میں ماہر ہوں۔

سامعین کرام! پرویز صاحب ایک اسلامک سکالر، فلاسفر اور ایک اصلاح پسند انسان تھے جنہوں نے ایک منفرد انداز میں قرآن کریم کی تعلیمات کی تشریح وترویج کی۔ ان کا اندازِ بیاں عقیدت پسندی، منطقی، سماجی اقتصادی اور اخلاقیات کی تعلیم پر مبنی ہے۔ انہوں نے قرآن کی Rational and Logical interpretation کی ہے۔ اور اس کے لئے انہوں نے Raason اور logic کا استعمال کیا ہے۔

معزز سامعین! پرویز صاحب سمجھتے تھے کہ سماجی، اقتصادی نظام جو قرآن نے ہمیں عطا کیا ہے اس کی بنیاد پر اگر معاشرہ اور پھر ریاست تشکیل دی جائے تو رزق کے حصول کے لئے انسان رسوا نہیں ہوگا۔ انہوں نے Feudal اور نظامِ سرمایہ داری کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ انہوں نے اس بات کو شدومد سے بیان کیا ہے کہ دولت اور ذرائع رزق کی غیر منصفانہ تقسیم سے انسان کی زندگی مشکلات کا شکار رہے۔

پرویز علیہ الرحمۃ نے قرآنِ کریم کی روشنی میں ہمیں یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ انسان بحیثیت انسان واجب التکریم ہے۔ انسان کا وقار، اُس کے حقوق اور اس کی صلاحیتوں کا اعتراف۔۔۔ جس کی بدولت انسان کی زندگی بہتر ہو سکتی ہے۔

انصاف، برابری اور ہمدردی یہ بنیادی اوصاف ہیں جو انسان کو بطورِ حق ملنے چاہیئے۔

عزیزانِ من! دنیا میں جتنے بڑے نام ہیں انہیں شہرت اپنے ہی کسی نظریہ سے ملی ہے۔ سقراط کا واقعہ مشہور ہے کہ وہ زہر کا پیالہ پیتا اور مسکرا کر کہتا ہے۔ ''میں تو مر رہا ہوں لیکن میری سوچ کبھی نہیں مر سکتی۔''

فکر ایک سے دوسرے تک اور بالآخر نسلوں میں منتقل ہو جاتی ہے اور افکار تازہ سے نمو پاتی ہے۔ پُر اثر شخصیت کو اپنی ذات پر اعتماد ہوتا ہے۔ خود پر اعتماد ایک ایسی چیز ہے جس کے بارے میں بدھ نے کہا تھا کہ:

''جس نے خود پر اعتماد کیا، زمانہ اس کے سامنے سرنگوں ہو جاتا ہے۔''

پرویز علیہ الرحمۃ نے اپنی ذات پر اسی اعتماد کی بدولت اپنی قرآنی فکر پیش کی ہے اور قرآنی فکر کی یہ روشنی اب پھیل رہی ہے۔

اب جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی
ہم نے تو دل جلا کے سرِ عام رکھ دیا

عزیزانِ من! اگر ہم بولتے جائیں، لکھتے جائیں تو پرویز صاحب کی تعریف میں زبانیں خشک ہو جائیں، لفظوں کا قحط پڑ جائے۔ دفتر کے دفتر سیاہ کئے جائیں، تب بھی حق ادا نہیں ہو گا۔

پشتو کا شعر ہے۔

ستاد خائست گلونو ڈیر دی
جولئ م تنگہ زه بہ کوم کوم ٹولہ وومہ

سامعین کرام! آپ یا آپ کے جاننے والوں میں سے کسی کو پرویز صاحب یا طلوعِ اسلام کے متعلق کوئی بدگمانی ہے تو ان کی خدمت میں اتنا عرض ہے کہ آپ ان سے اتنا کہیے کہ جو کچھ آپ کہتے ہیں اس کی تائید میں طلوعِ اسلام یا پرویز صاحب کی کوئی تحریر دکھائیے۔ آپ چاہیں تو خود اس کی تحقیق کر سکتے ہیں۔ لوگوں کی باتوں میں مت آیئے۔ پرویز صاحب کے تمام درس قرآن، ٹیپ اور ویڈیوز میں موجود ہیں۔ کتابیں اور پمفلٹس دستیاب ہیں ہر مہینہ کے پہلے جمعہ سلطان ٹاور مکان باغ میں دوپہر دو بجے پرویز صاحب کا درسِ قرآن کا Video کے ذریعے دیکھ سن سکتے ہیں پھر خود فیصلہ کیجئے کہ آیا اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات ہوتی ہے۔ محض سنی سنائی باتوں پر نہ جایئے کیونکہ اللہ کا حکم ہے۔ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ط (17:36)

''جس بات کا تمہیں ذاتی طور پر علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ لگ جایا کرو۔''

اللہ تعالیٰ آپ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

والسلام

وسیم احمد یزدانی، ایبٹ آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فکرِ پرویز علیہ رحمہ سے اختلاف
ملک و ملت کے لیے نقصان یا اصلاح؟

سرود رفتہ باز آید کہ ناید؟
نسیمی از حجاز آید کہ ناید؟
سرآمد روزگار این فقیری
دگر دانای راز آید کہ ناید؟
(ارمغان حجاز)

جو سرود چلا گیا وہ پھر آتا ہے یا نہیں آتا۔ عرب کے خطہ حجاز مقدس سے پھر ٹھنڈی ہوا آتی ہے یا نہیں آتی۔ اس فقیر کا آخری وقت آ گیا ہے (زندگی ختم ہوئی) کوئی دوسرا (میرے علاوہ) راز کو سمجھنے والا آتا ہے یا نہیں آتا۔

یہ الفاظ علامہ اقبال کے اپنے بارے میں تھے۔ مگر چشم فلک نے یہ نظارہ کیا کہ وہ دانائے راز آیا اور حجاز سے آنے والی نسیم بھی چلی اور کم و بیش نصف صدی تک چلتی رہی اور اپنی خوشبو سے پاکستان کی فضاؤں کو معطر کرتی رہی۔

ایک ادیب، ایک بلند پایہ مفکر، ایک فلسفی، زبان دان، قرآن پاک پہ گہری نظر اور عبور رکھنے والے، تحریک پاکستان کے کارکن، قائداعظم محمد علی جناح کے دست راست، شارح کلام اقبال، جناب علامہ غلام احمد پرویز صاحب نہ صرف دانائے راز تھے بلکہ اس سربستہ راز کو کھول کر لوگوں کے سامنے رکھنے والے ایک نابغہ روزگار شخصیت تھے۔ اُن کی ان تمام خوبیوں پہ بات ہوتی رہتی ہے۔ اور ہونی بھی چاہیئے، کیونکہ قوم کو ایک درست سمت دکھانے کی جو کوشش آپ نے کی، کوئی دوسرا اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہو سکتا۔ جو کام پورے کے پورے اداروں نے کرنا ہوتا ہے وہ کام آپ نے تن تنہا سرانجام دیا۔

معارف القرآن، تبویب القرآن، لغات القرآن اور مفہوم القرآن جیسی شہرہ آفاق کتب کی تصنیف آپ کا کارنامہ ہے، یہ تمام تصانیف ایک راہ بھٹکی ہوئی قوم کو سیدھی راہ پر گامزن کرنے کی جانب کوششیں تھیں، مگر بدقسمتی سے اور مذہبی پیشوائیت کی ہٹ دھرمی اور غلط پراپیگنڈہ کے باعث یہ ساری کوششیں اس حد تک ثمر بار نا ہو سکیں جس حد تک ان کو ہونا چاہیے تھا۔

نہ ستارے میں ہے، نے گردشِ افلاک میں ہے
تیری تقدیر میرے نالہ بیباک میں ہے
(بالِ جبریل)

عزیزانِ گرامی قدر آج میں وہ نقصانات آپ کے سامنے رکھنے کی کوشش کروں گا، جو نقصانات پرویز صاحب کے خلاف منفی پراپیگنڈہ کرنے سے اس ملک وملت کو ہو گیا ہے۔ اور قوم نے اگر ابھی بھی ہوش کے ناخن نہ لیے تو پھر سب جانتے ہیں کہ گزرا ہوا وقت کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ سب سے پہلا نقصان جو ملک وملت کو اٹھانا پڑا وہ انتشار وافتراق تھا۔ اگر قیام پاکستان کے ساتھ ہی جیسا کہ قائدِ اعظم علیہ رحمہ۔ اور علامہ پرویز علیہ رحمہ چاہتے تھے، قرآن کو اپنا دستور مان لیا جاتا۔ اور ملک کے لیے مزید قوانین سازی اس کی روشنی میں کی جاتی تو تمام قسم کے تعصّبات، لسانیت، مذہبی فرقہ بندی سے بتدریج چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا تھا۔ اور قرآن کی تعلیمات کے عین مطابق معاشی اور معاشرتی عدل وانصاف پر مشتمل ایک معاشرے کی بنیاد رکھ دی جاتی۔ اور ایک ایسا معاشرہ جس میں صرف انسانیت کی نشونما کے بارے میں سوچا جاتا اور تمام قسم کے طبقات ختم کرنے کی طرف راہ ہموار کی جاتی تو ملک دولخت نہ ہوتا بلکہ ملت کا اتفاق واتحاد برقرار رہتا۔ اور یہ ہی توحید تھی فرقہ بندی اور گروہ بندی تو شرک ہے۔

آنکہ نام تو مسلمان کردہ است
از دوئی سوی یکی آوردہ است
(رموزِ بیخودی)

یہ جو اس نے تیرا نام مسلمان رکھا ہے۔ اس سے تجھے کثرت سے وحدت کی جانب لایا گیا ہے۔

خویشتن را ترک و افغان خواندہ ئی
وای بر تو آنچہ بودی ماندہ ئی
(رموزِ بیخودی)

تو اپنے آپ کو ترک وافغان کہتا ہے، افسوس ہے تجھ پر تو جو تھا وہی رہا

وارہان نامیدہ را از نامہا
ساز با خم درگزر از جامہا
(رموزِ بیخودی)

امت مسلمہ کو ان ناموں سے چھٹکارہ دلا! خم (قرآن) سے اپنی نسبت قائم رکھو، پیالوں پر نہ جاؤ عزیزانِ گرامی قدر! ہم سب یہ بات بخوبی جانتے ہیں علامہ غلام احمد پرویز صاحب کا شمار برصغیر کے ان چند مفکرین میں

ہوتا ہے جنہوں نے قرآن کو ایک فکری اور عملی دستور کے طور پر سمجھنے اور پیش کرنے کی کوشش کی، وہ تقلید کے نہیں بلکہ تدبر اور اجتہاد کے قائل تھے، اور قرآن کو دین کی اصل بنیاد اور ماخذ مانتے تھے تاہم، چونکہ ان کے خیالات روایتی مذہبی تعبیرات سے متصادم تھے۔ اس لئے انہیں قدم قدم پر مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور ایک عظیم مقصد اور کام پس منظر میں چلا گیا۔

علامہ صاحب کے افکار ونظریات کو رد کرنے سے پاکستان میں فکری آزادی اور اجتہادی رویہ مزید محدود ہو گیا، اگر ان کی فکر کو مثبت انداز میں لیا جاتا تو آج شاید ہمارا معاشرہ زیادہ سائنسی، منطقی، اور ترقی پسند سوچ رکھتا۔ کیونکہ علامہ صاحب نے قرآن کو براہ راست سمجھنے پر زور دیا اور حدیث کی چھان بین کرنے کا بیڑہ اٹھایا اس لئے ان کی بے جا مخالفت شروع ہو گئی جس کے باعث پاکستان میں قرآن کو غور وفکر کے ساتھ سمجھنے کی روایت کمزور پڑ گئی اور تقلیدی ذہنیت غالب آ گئی۔ یہ ایک اور نقصان تھا جو ملک وملت کو اٹھانا پڑا، اور اس سے مزید نقصان یہ ہوا کہ روایتی مذہبی بیانیہ زور پکڑ گیا اور مزید مستحکم ہو گیا، جو فرقہ واریت، شدت پسندی اور عدم برداشت کو ہوا دیتا رہا۔ اگر علامہ صاحب کے افکار کو جگہ دی جاتی تو شاید پاکستان میں ایک زیادہ متوازن اور عقل پر مبنی دینی فکر فروغ پاتی۔

پرویز صاحب دین کو سائنسی اور منطقی بنیادوں پر سمجھنے کے قائل تھے۔ ان کے نظریات کو رد کرنے کا ایک نقصان یہ ہوا کہ پاکستان میں مذہب اور سائنس کے درمیان حائل خلیج مزید گہری ہو گئی۔ اس کے نتیجے میں جدید سائنسی ترقی اور دینی فکر کو ہم آہنگ کرنے کی کوششیں کمزور پڑ گئیں۔

عزیزان گرامی قدر: اگر پرویز صاحب کی فکر کو اپنایا جاتا تو شاید پاکستان میں ایک ایسا اسلامی فلاحی نظام پروان چڑھتا جو استحصال، جاگیرداری اور مذہبی انتہا پسندی کے خلاف زیادہ مضبوط ہوتا۔ مگر ان کے افکار ونظریات کو رد کرنے سے روایتی نظام جوں کا توں رہا۔ اور معاشرہ اصلاح کی بجائے جمود کا شکار ہوتا چلا گیا۔ اگر علامہ صاحب کے نظریات سے ان کی فکر سے صرف اختلاف کیا جاتا تو ٹھیک تھا مگر مذہبی حلقوں میں ان کی فکر کو مکمل طور پر مسترد کر دینا ایک بہت بڑا نقصان تھا۔ اگر علامہ موصوف کے اجتہادی نظریات کو، علمی بحث ومباحثے میں جگہ دی جاتی تو آج پاکستان فکری طور پر زیادہ آزاد، علمی ترقی میں آگے۔ اور مذہبی انتہا پسندی سے زیادہ محفوظ ہو سکتا تھا۔

نخل فکرم نا امید از برگ و بر
یا تبر بفرست یا باد سحر
(اسرار خودی)

میرے فکر کا درخت برگ وبر سے نا امید ہے، یا اسے کلہاڑے کی نظر کیجیے یا اسے باد سحر سے نواز دیجئے، شکریہ

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت ادارہ طلوعِ اسلام، لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20X30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	ہدیہ
سورۃ الفاتحہ	(1)	240	200/-
سورۃ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-
سورۃ البقرہ (اوّل)	(2)	500	400/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-
سورہ آل عمران (اوّل)	(3)	472	500/-
سورہ آل عمران (دوم)	(3)	480	500/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-
سورۃ المائدہ	(5)	450	500/-
سورۃ الانعام	(6)	600	600/-
سورۃ الاعراف (اوّل)	(7)	480	500/-
سورۃ الاعراف (دوم)	(7)	400	500/-
سورۃ الانفال	(8)	210	250/-
سورۂ توبہ	(9)	530	550/-
سورۂ یونس	(10)	360	400/-
سورۃ ھود	(11)	400	400/-
سورۃ یوسف	(12)	288	300/-
سورۂ رعد، ابراہیم، الحجر	(13-14-15)	500	500/-

سورۃ النحل	(16)	334	300/-
سورۂ بنی اسرائیل	(17)	396	400/-
سورۃ الکہف، سورۂ مریم	(18-19)	532	500/-
سورۂ طٰہٰ	(20)	416	350/-
سورۃ الانبیاء	(21)	336	300/-
سورالحج	(22)	380	350/-
سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-
سورۃ النور	(24)	264	350/-
سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-
سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ العنکبوت	(29)	388	350/-
سورۂ روم، لقمان، السجدہ	(30-31-32)	444	400/-
سورۃ الاحزاب، سبا، فاطر	(33-34-35)	570	400/-
سورۂ یٰسین	(36)	164	150/-
سورۃ الصفٰت، ص، زمر	(37-38-39)	450	400/-
سورۃ مومن حٰم سجدہ، سورہ شوریٰ	(40-41-42)	624	550/-
سوُر زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45-46-47)	520	500/-
سورۂ الفتح، الحجرات، قٓ، الذاریات، الطور، النجم	(48-49--51-50-52-53)	550	500/-
سورۂ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55-56-57)	384	400/-
28واں پارہ (مکمل) مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم	-64-65-66) (58-59-60-61-62-63	300	300/-
29واں پارہ (مکمل)		544	400/-
30واں پارہ (مکمل)		624	400/-
شرح جاوید نامہ		800	1000/-
فہرست موضوعات مطالب القرآن فی دروس الفرقان		800	1000/-

پمفلٹس --- PAMPHLETS

ادارہ طلوع اسلام دینی موضوعات پر پمفلٹس شائع کرتا رہتا ہے

فی پمفلٹ قیمت 20 روپے علاوہ ڈاک خرچ

اسلام آگے کیوں نہ چلا	قرآن مجید کے خلاف گہری سازش	دو قومی نظریہ
اسلام کیا ہے؟	قربانی	عورت قرآن کے آئینے میں
اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟	قیامت موجود	پاکستان کی نئی ''زیارت گاہیں''
اسلام اور مذہبی رواداری	قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں!	کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟
کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟	قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر	تحقیق ربوٰ (مسئلہ سود)
اسلامی قانون کی اصل و بنیاد کیا ہے؟ (مغربی پاکستان ہائیکورٹ کا فیصلہ)	ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟	کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟
اسلامی آئیڈیالوجی	ہندو کیا ہے؟	بنیادی حقوق انسانیت اور قرآن
اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش (20 روپے علاوہ ڈاک خرچ)	ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ (قرآنی اصطلاحات کی تشریح)	تکذیب دین کون کرتا ہے اور مصلّٰی کسے کہتے ہیں
اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں	ہماری تاریخ میں کیا ہے؟	روٹی کا مسئلہ
اسلامی قانون سازی کا فریضہ (بال سے باریک تلوار سے تیز)	ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟	جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
انسانیت کا آخری سہارا	ہم عید کیوں مناتے ہیں؟	نماز کی اہمیت
اے کشتۂ سلطانی وملائی وپیری	مقام اقبالؒ	ضبطِ ولادت (خاندانی منصوبہ بندی)
اقبال کا مرد مومن	مقام محمدی ﷺ	علماء کون ہیں؟
اندھے کی لکڑی	مرزائیت اور طلوع اسلام	فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں
آرٹ اور اسلام	ماؤزے تنگ اور قرآن	کافرگری
قرآن کا معاشی نظام	مومن کی زندگی	حرام کی کمائی
قرآن کا سیاسی نظام	جہاں مارکس ناکام رہ گیا	عالمگیر افسانے

8-مذہب کشمکش حیات سے فرار سکھاتا ہے۔

دین زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔

9-مذہب تقدیر کے بہانے انسان کو بے عمل بنا دیتا ہے۔

دین، اسے تقدیر شکن قوت عطا کر کے، حرکت وعمل کا شعلۂ جوالہ بنا دیتا ہے۔

10-مذہب خاک کے آغوش میں تسبیح ومناجات کا نام عبادت رکھ کر انسانوں کو خود فریبی میں مبتلا رکھتا ہے۔

دین، اسے وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل کا پیغام دیتا اور نظامِ خداوندی کو دنیا کے ہر نظامِ باطل پر غالب کرنے کو عبادت کی غایت بتاتا ہے۔

11- مذہب، کائنات کی ہر حسین شے پر منہ بسورنا اور نعمائے خداوندی سے اجتناب سکھاتا ہے۔

دین اعلان کرتا ہے کہ وہ کون ہے جو زیب وزینت کی ان چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ہے، جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے (القرآن)۔

12-مذہب ہر جدت (نئی چیز) کو گناہ قرار دینے تک لے جاتا ہے۔

دین کہتا ہے کہ کل یوم ھو فی شان۔ زندگی کے تقاضے ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں اس لئے جدت طرازی عین تقاضائے حیات ہے۔

13-مذہب اپنے پیغام کے حق کی دلیل میں اسے اسلاف کا مسلک قرار دے کر بطور سند پیش کرتا ہے۔ ان کی طرف سے پیش کردہ عقائد پر ایمان بلا علم ودلیل لانے پر زور دیا جاتا ہے۔

دین انسان کی علمی اور عقلی صلاحیتوں کو جلا دینے کا موجب اور اسلاف کے مسالک کی بلا دلیل پیروی سے منع کرتا ہے۔ وہ اپنے ہر دعویٰ کو دلیل اور برہان سے پیش کرتا ہے اور عقل وتدبر سے کام لینے کی تاکید بھی۔

14-مذہب کا تصور مفاد پرست انسانوں کے ذہن کا تراشیدہ ہے۔ ان میں سبھی ملوکیت (فرعون)، سرمایہ داری (قارون) اور مذہبی پیشوائیت (ہامان) کے نمائندے باہمی اشتراک سے دوسروں کی محنت سے کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرنے کے لئے ہر جائز وناجائز حیلے تراش کر مذہب میں شامل کر لیتے ہیں۔ خود مترفین بن کر دوسروں کو محکوم بنا لیتے ہیں۔

دین مذہب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو آزادی کی دعوت دیتا ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا محکوم اور اطاعت گذار بنائے۔ اطاعت صرف خدا (اس کے قوانین) کی کی جا سکتی ہے اور یہ قانون سب کے لئے برابر ہونے کی وجہ سے تمام نوعِ انسانی کے لئے مساوات کا پیغام رکھتا ہے۔

15-مذہب اس راستے کو کہتے ہیں جو انسانوں کا وضع کردہ ہو۔

دین اس قانون یا نظام کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا ہو۔

اس لئے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن نے نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے دین ہی کو پیش کیا ہے اور اسے ہی اسلام کا نام دیا ہے۔ لہٰذا مسلم مذہب کی نہیں دینِ اسلام کی اطاعت کرتا ہے۔

☆☆☆

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.78
ISSUE
04

Monthly **TOLU-E-ISLAM**

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/idaratolueislam1/ www.youtube.com/idaratolueislam

کیا سناتا ہے مجھے تُرک و عرب کی داستاں
مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز
لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
ہو گئی رُسوا زمانے میں کُلاہِ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے، ہیں آج مجبورِ نیاز
لے رہا ہے مے فروشانِ فرنگستاں سے پارس
وہ مئے سرکش حرارت جس کی ہے مینا گداز
(بانگِ درا، علامہ اقبالؒ)